واردات

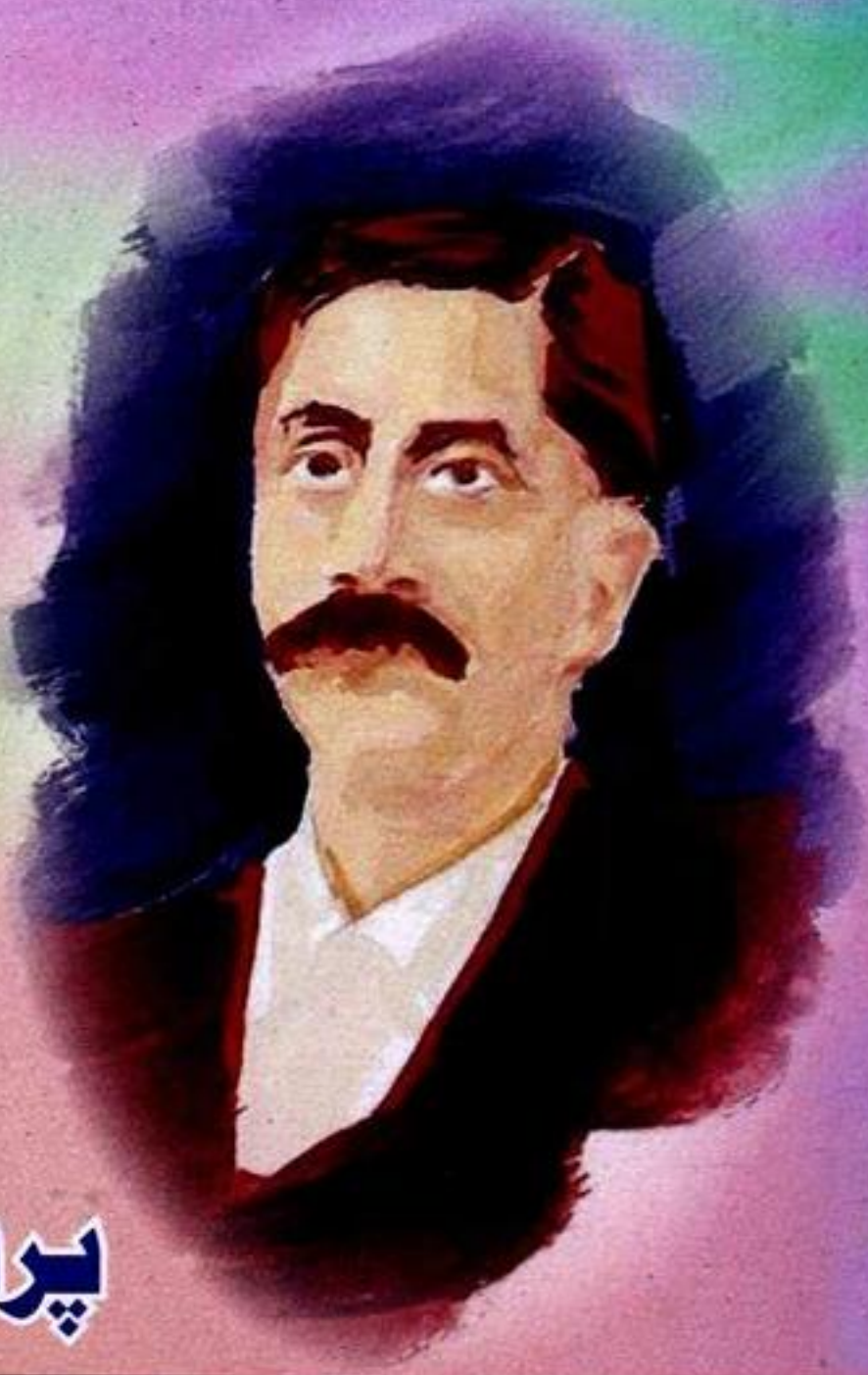

پریم چند

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

واردات

منشی پریم چند

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

Email:monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003

جون 2012ء　　تعداد:1000　　قیمت:-/45روپے

نیو پرنٹ سنٹر، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

فہرست

۱۔	شکوہ شکایت	۵
۲۔	معصوم بچہ	۱۵
۳۔	بدنصیب ماں	۲۳
۴۔	شانتی	۳۶
۵۔	روشنی	۴۷
۶۔	مالکن	۵۴
۷۔	نئی بیوی	۶۸
۸۔	گلّی ڈنڈا	۸۱
۹۔	سوانگ	۸۸
۱۰۔	انصاف کی پولیس	۹۸
۱۱۔	غم نداری بُز بخر	۱۰۸
۱۲۔	مفت کرم داشتن	۱۱۷
۱۳۔	قاتل ماں	۱۲۲

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ تو اسی گھر میں گزر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہوں گے، لیکن جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو اُن لوگوں کی تعریف میں مزا آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کیے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے اس کی تعریف دُنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگ دل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انھیں کو دیکھو، صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے، نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انھیں ایسی ہی دکانوں کا سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دکان سے چیزیں لایا کرو وہاں مال زیادہ کھپتا ہے اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں ٹٹپونجیوں سے ان کو ہمدردی ہے اور وہ انہیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھُنا ہوا، چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے، دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو، کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل، اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم۔ تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں، مگر دام دے آئیں گے اعلا درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے۔ روز روز کی مصیبت برداشت نہیں ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر ٹٹپونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمھیں نے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیے، بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔

پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے ؟ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو؟اس کا کوئی جواب نہیں۔ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں، دھوکا کھاؤ گی۔میں ایک سنار کو جانتا ہوں۔میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔میرے ساتھ چال بازی نہیں کرسکتا۔میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا ،تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے ان کے حوا لے کیے۔اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی، برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔روپیٹ کر بیٹھ رہی۔ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں۔ان کی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلانچ، بے سروسامان ہیں، جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لیے گلا نہیں چھوڑتے۔مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے روپے ادا کیے ہوں۔آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے، مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔جب کہتی ہوں روپے دے آئے اب مانگ کیوں نہیں لاتے کیا مر گئے تمھارے دوست؟ تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے۔آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا۔خیر سوکھا جواب نہ دو میں یہ بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو، مگر ٹال تو سکتے ہو۔کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو؟ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔بے چارے کیسے انکار کریں۔آخر لوگ جان جائیں گے یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔دنیا انھیں امیر سمجھتی ہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گروی رکھنے پڑیں۔سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔جب تک روپے کے وارے نیارے نہ کر لے اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے۔ذرا سا تو گھر، مشکل سے دو تو چارپائیاں، اوڑھنا بچھونا بھی بافراط نہیں مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دینے کے لیے تیار۔آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے، اس لئے انہیں چارپائی بھی چاہیے، اوڑھنا بچھونا بھی چاہیے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔زمین پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے

ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آجاتی ہے۔ گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لیے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں جو ضرورت کے وقت ان کی دھیلے سے بھی مدد کر سکے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مردِ خدا نے تو آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے۔ ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے، وہ آپ کا دوست ہے۔ شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں، آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں، کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں، مدمغ ہیں، خوشامد پسند ہیں، ان کے پاس کیسے جائیں، دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی نوکر رکھنے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے، مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں! بڑا فرماں بردار ہے، پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز۔ خیر میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا، آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں۔ بے ایمان نہ تھا مگر احمق نمبر اول کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے۔ کم بخت دکان داروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیا دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان اکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا۔ لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے، اس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز ادھر، اوپر کی نیچے، گویا سارے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل، مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے،

گویا کوئی بات ہی نہیں۔ان دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا: ''اگر کل سے تو نے سلیقے سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔'' سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔آپ نے فوراً ہنس کر کہا: ''دیکھتی کیا ہو، آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا۔تم طریقہ تو بتلاتی نہیں ہو، الٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔'' لیجیے صاحب! یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر، میں نے سمجھا کہ اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا، اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تن دہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے: ''اس کی تنخواہ تو بیباک کر دو۔'' خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے۔اس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ایک کرتا دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے، بڑی مشکلوں سے رکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بے کاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی نہیں۔ حضرت ہی کا تو شہ خانہ ایک بقچی میں آ جائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی کی شدت تھی، اس کا مجھے بھی خود احساس تھا۔غریب پر کیا گزرتی ہے، اس کا علم تھا۔لیکن میرے یا آپ کے پاس افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب روسا اور امراء کے پاس ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری ہوئی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا، اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا؟ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے، وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی قدرت نے انھیں عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے، آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے دیکھا نہ گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ گئے تو اور بھی آفت آ جائے۔ آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے کہ میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے۔ سیدھی سادی حماقت۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا، اسی کو میں نے کئی بار رات شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے، تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیے؟ اتنی عمر گزر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لیے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بے شک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں، مطلق عذر نہیں مگر روپیا بھی دے دوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بچارے اپنے لیے بھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوادوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے، اور مردوں کو دیکھتی ہوں، گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کے زیور، کپڑے، شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لیے بھی مٹھائی، کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں، قسم سی کھالی ہے۔ اس لیے میں تو انھیں بخیل کہوں گی، مردہ دل ہی کہوں گی۔ فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ اُن کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص، نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے نذر یا ڈالی کی بات تو الگ ہے، اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اُٹھائیں تو کون اُٹھائے۔ اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں، آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ، مشکل کام آ جائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسّو اور پسّو وغیرہ خطابات بھی ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو؟ دُنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے، اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے، پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے، جس پر اعتبار وتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔

افسر بھی انسان ہیں۔ان کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہوتی ہے وہ کہاں پوری ہو جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعوا ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیل دار ہیں۔ گھر کی جائیداد انھیں کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں۔ مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی۔ میں نے کہا اپنے برادرِ مکرم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں۔ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی۔ میں نے بہت مجبور کیا، تو آپ نے خط لکھا۔ معلوم نہیں خط میں کیا لکھا لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا: ''کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟'' آپ نے ترش ہو کر کہا: ''ابھی ایک ہفتہ تو خط بھیجے ہوا۔ ابھی کیا جواب آ سکتا ہے۔'' ایک ہفتہ اور گزرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش۔ کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی بھی تعریف ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادرِ مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی، تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کیے جاتے تھے، اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے، محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے۔ لیکن میں کیا چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتے گزر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آ پہنچی تو میں نے پوچھا: ''کیا ہوا؟ تمھارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائیداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا منافع نو دس سال قبل تھا، اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک جھنجی کوڑی بھی ہمیں نہ ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیے۔ دو ہزار نہ ہو، ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو، ڈھائی سو ہو، کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھرنے کو تو ہو۔ تحصیل دار کی آمدنی ہماری آمدنی سے چوگنی ہے، رشوتیں بھی لیتے ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔'' آپ ہیں ہیں، ہاں ہاں کرنے لگے۔ بچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیز و اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جایداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے بھی گڑھنے نہیں آتے۔ مجھ سے

پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بتا دیتی۔ کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا۔ یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا۔ گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی، اس میں دیوالہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو لچری بات۔ اس جولانیِ طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بی بی سے قرض لیے تب جا کر کہیں کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادرانِ یوسف سے خدا بچائے۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں، دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں، سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحبزادے ابھی گھوم کر نہیں آئے۔ میں گھبرا رہی ہوں۔ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں: ''جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا؟ نہ جانے تمھارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمھیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا۔'' تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں: ''ابھی نہیں آیا؟ بڑا شیطان ہے۔ آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں، مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔'' یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کو تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں، ادھر لڑکا آ جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں: ''کدھر سے آ گیا؟ وہ بچارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے۔ یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے۔ آج قدر و عافیت معلوم ہو گی۔'' لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان اور بدحواس، گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں: ''آیا کہ نہیں؟''

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں: ''آ کر بیٹھا تو ہے۔ جا کر پوچھتے کیوں نہیں، پوچھ کر ہار گئی کہاں گیا تھا، کچھ بولتا ہی نہیں۔''

آپ گرج پڑتے ہیں: ''منو یہاں آؤ۔''

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامے سے باہر ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضب ناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں، مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصے سے کہتے ہیں:

''تم کہاں گئے تھے جی! منع کیا جاتا ہے۔ مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا ادھر ادھر گھومتا ہے؟''

میں سمجھ رہی ہوں یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا، گریز تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہوگیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں: ''تم تو جیسے ڈر گئے، بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے، اس طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے، کل نو بجے خبر لائے گا۔ اس نے بھی دل میں کیا سوچا ہوگا۔''

آپ فرماتے ہیں: ''تم نے سنا نہیں میں نے کتنی زور سے ڈانٹا۔ بچے کی روح ہی فنا ہوگئی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے۔''

''تم نے ڈانٹا تو نہیں ہاں آنسو پونچھ دیے۔''

آپ نے ایک نئی اپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے، کبھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے، مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کوئی لڑکا کنکوا اڑا لے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے۔ ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوگئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو ابا جان کی صحت ہی کون سی بہت اچھی تھی۔ بچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی۔ لیکن کچھ بھی ہو، تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوا کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ۔

یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل وجان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ: ''تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے۔ تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے، نہ ہو، لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجئے، بُرے بُرے شوق مت پیدا کیجیے۔ اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے تو کم از کم بگاڑیے مت۔'' لگے باتیں بنانے۔ ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے۔ لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں: ''چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے۔ خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی، غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں، ان پر مزے سے بیٹھنا۔'' اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں، کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ایک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ جیت کر آجاتا تو کتنے خوش ہوتے ہیں، گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کو چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا۔ ہاتھ یا پانو ٹوٹ گیا تو بچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے، چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہوسکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں، لیکن اس کا اثر عام حالات پر کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس برس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیے، جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑا دی۔ جب اس طرح ایک سال پورا گزر گیا اور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے کیوں کہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی، حالاں کہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ ایک اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ شادی کے بخیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ رسم بے ہودہ ہے، یہ رسم بے معنی ہے۔ یہاں روپے کی کیا ضرورت؟ یہاں گیتوں کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں، وہ کیوں، یہ تو صاف جہیز ہے۔ تم نے میرے منہ میں کالک لگا دی، میری آبرو مٹا دی۔ ذرا خیال کیجیے، بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر رد و قدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت

رات کے بارہ بجے تھی۔ اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا، کھانا کھایا۔ خیر رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے۔ جانور بھی دان دیے جا سکتے ہیں، لیکن لڑکی کا دان ایک لچری بات ہے۔ کتنا سمجھاتی ہوں: ''صاحب پرانا رواج ہے، شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔'' عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے، مگر آپ کان ہی نہیں دھرتے۔ پیروں پڑی، یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا جو کچھ کرنا ہوگا میں کرلوں گی۔ تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مردِ خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آ گیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے، یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی۔ آپ گھر جھانکے تک نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں۔ مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حُسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے، ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پُرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں۔ اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول، نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے، ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف، بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

☆☆☆

معصوم بچہ

(۱)

گنگو کو لوگ برہمن کہتے ہیں اور وہ اپنے کو برہمن سمجھتا بھی ہے۔ میرے سائیس اور خدمت گار مجھے زور سے سلام کرتے ہیں۔ گنگو مجھے کبھی سلام نہیں کرتا ہے۔ وہ شاید مجھ سے پالاگن کی توقع رکھتا ہے۔ میرا جھوٹا گلاس کبھی ہاتھ سے نہیں چھوتا اور نہ کبھی میری اتنی ہمت ہوئی کہ اس سے پنکھا جھلنے کو کہوں۔ جب میں پسینے میں تر ہوتا ہوں اور وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوتا تو گنگو آپ ہی آپ پنکھا اٹھا لیتا ہے، لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہے اور میں بھی نہ جانے کیوں فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پنکھا چھین لیتا ہوں۔ تیز مزاج آدمی ہے، بات کی مطلق برداشت نہیں۔ ایسے بہت کم آدمی ہیں جن سے اس کی دوستی ہو۔ سائیس اور خدمت گار کے ساتھ بیٹھنا شاید وہ کسرِ شان سمجھتا ہے۔ میں نے اسے کسی سے بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا، نہ میلے تماشے میں جاتے دیکھا۔ حیرت یہ ہے کہ اسے بھنگ بوٹی سے بھی شوق نہیں جو اس طبقے کے آدمیوں میں ایک غیر معمولی وصف ہے۔ وہ کبھی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور نہ اسے ندی میں اشنان کرنے کا خبط ہے۔ بالکل ناحرف شناس آدمی ہے، لیکن پھر بھی وہ برہمن ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا اس کی تعظیم اور خدمت کرے، اور کیوں نہ چاہے؟ جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں اور اُسی شان سے قابض ہیں گویا انھوں نے خود پیدا کی ہو، تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا۔ یہی اس کا ترکہ ہے۔

میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اپنے ملازموں سے بہت کم بولتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے پاس نہ آئے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے آدمیوں کو آواز دیتا پھروں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے صراحی سے پانی انڈیل لینا یا لیمپ جلا لینا یا اپنے جوتے پہن لینا یا الماری سے کوئی کتاب نکال لینا اس سے کہیں زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے کہ ہینگن اور میکو کو پکاروں۔ اس سے مجھے اپنی آزادی اور خود اختیاری کا احساس ہوتا ہے۔ نوکر بھی میرے مزاج سے واقف ہو گئے ہیں اور بلا ضرورت میرے پاس بہت کم آتے ہیں۔ اس

لیے ایک دن علی الصبح جب گنگو میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو مجھے کچھ ناگوار گزرا۔ یہ لوگ جب آتے ہیں تو یا تو پیشگی حساب میں کچھ مانگنے کے لیے یا کسی دوسرے ملازم کی شکایت کرنے کے لیے اور مجھے یہ دونوں حرکتیں حد درجہ ناپسند ہیں۔ میں پہلی کو ہر ایک کی تنخواہ بیباق کر دیتا ہوں اور بیچ میں جب کوئی مانگتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔ کون دو دو، چار چار روپے کا حساب رکھتا پھرے۔ پھر جب کسی کو منہ بھری مزدوری مل گئی تو اسے کیا حق ہے کہ اسے پندرہ دن میں خرچ کر دے اور قرض یا پیشگی کی ذلت اختیار کرے، اور شکایتوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ میں شکایت کو کمزوری کی دلیل سمجھتا ہوں یا خوشامد پرستی اور امداد طلبی کی کمینہ کوشش۔

میں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: ''کیا معاملہ ہے۔ میں نے تو تمھیں بلایا نہیں۔''

گنگو کے تیکھے، بے نیاز چہرے پر آج کچھ ایسی لجاجت، کچھ ایسی التجا، کچھ ایسا حجاب تھا کہ مجھے تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ جواب دینا چاہتا ہے مگر الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

میں نے ذرا اور تیز ہو کر کہا: ''آخر بات کیا ہے؟ کہتے کیوں نہیں۔ تم جانتے ہو یہ میری ہوا خوری کا وقت ہے، مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

گنگو نے مایوسانہ لہجے میں کہا: ''تو آپ ہوا کھانے جائیں۔ میں پھر آ جاؤں گا۔''

یہ صورت اور بھی پریشان کرنے والی تھی۔ اس رواروی میں ایک منٹ میں وہ اپنی سرگزشت کہہ سنائے گا۔ وہ اتنا جانتا ہے کہ مجھے زیادہ فرصت نہیں۔ دوسرے موقع پر تو کمبخت گھنٹوں روئے گا۔ میرے کچھ لکھنے پڑھنے کو تو شاید کام سمجھتا ہو لیکن غور و خوص کو جو میرے لیے انتہائی مصروفیت ہے، وہ میرے آرام کا وقت سمجھتا ہے۔ یقیناً یہ اسی وقت آ کر میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔

میں نے تلخی کے ساتھ کہا: ''کچھ پیشگی مانگنے آئے ہو؟ میں پیشگی نہیں دیتا۔''

''جی نہیں سرکار، میں نے تو کبھی پیشگی نہیں مانگی۔''

''کیا کسی کی شکایت کرنا چاہتے ہو؟ مجھے شکایتوں سے نفرت ہے۔''

''جی نہیں سرکار، میں نے تو کبھی کسی کی شکایت نہیں کی۔''

''تو پھر خواہ مخواہ کیوں سر پر سوار ہو گئے؟''

گنگو نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اس کے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گویا کوئی جست لگانے کے لیے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے۔ آخر اس نے کہا: ''مجھے اب آپ چھٹی دے دیں۔ میں اب آپ کی نوکری نہ کر سکوں گا۔'' یہ اس قسم کی پہلی استدعا تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میری خودداری کو چوٹ لگی۔ میں جو اپنے آپ کو انسانیت کا پتلا سمجھتا ہوں، اپنے ملازموں سے سخت کلامی نہیں کرتا، اپنی آقائیت کو حتی الامکان نیام میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس

درخواست پر کیوں نہ حیرت میں آجاتا۔ تحکم کے لہجے میں پوچھا: ''کیوں، کیا شکایت ہے؟''

آپ نے تو ہجور جیسی نیک طبیعت پائی ہے ویسی کیا کوئی پائے گا، لیکن بات ایسی آپڑی ہے کہ اب میں آپ کے یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسا نہ ہو پیچھے سے کوئی بات ہو جائے تو آپ کی بدنامی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے ڈیل سے آپ کی آبرو میں بٹا لگے۔''

میرے دل میں الجھن پیدا ہوئی۔ دریافت حال کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ہوا خوری کا نشا اتر گیا۔ توکل کے انداز سے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر بولا: ''تم تو پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کیا معاملہ ہے؟''

گنگو نے مجسم معذرت بن کر کہا: ''بات یہ ہے کہ عورت جو ابھی بدھوا آشرم سے نکال دی گئی ہے، وہی گومتی دیو....''

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے بے صبر ہو کر کہا: ''ہاں نکال دی گئی ہے تو پھر؟ تمھاری نوکری کا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''میں اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں ہجور!''

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ یہ پرانے خیال کا بونگا برہمن جسے نئی تہذیب کی ہوا تک نہیں لگی، اس عورت سے شادی کرے گا جسے کوئی بھلا آدمی اپنے گھر میں قدم بھی نہ رکھنے دے گا۔ گومتی نے محلے کی پرسکون فضا میں تھوڑی سی حرکت پیدا کر دی تھی۔ کئی سال قبل وہ بدھوا آشرم میں داخل ہوئی تھی۔ تین بار آشرم کے منتظموں نے اس کی شادی کر دی، مگر ہر بار وہ ہفتہ عشرہ کے بعد بھاگ آئی۔ یہاں تک کہ آشرم کے سکریٹری نے اب کی بار اسے آشرم سے نکال دیا تھا۔ وہ اسی محلے میں ایک کوٹھری لے کر رہتی تھی اور سارے محلے کے شہدوں کے لیے دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

مجھے گنگو کی سادہ لوحی پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ اس بے وقوف کو ساری دنیا میں کوئی عورت ہی نہ ملتی تھی جو اس سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ جب وہ تین بار شوہروں کے پاس سے بھاگ آئی تو اس کے پاس کتنے دنوں رہے گی۔ کوئی گانٹھ کا پورا آدمی ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ شاید سال چھ مہینے ٹک جاتی۔ یہ محض آنکھ کا اندھا ہے۔ ایک ہفتہ بھی تو نباہ نہ ہوگا۔

میں نے تنبیہہ آمیز لہجہ میں پوچھا: ''تم اس عورت کے حالات سے واقف ہو؟''

گنگو نے عین الیقین کے انداز سے کہا: ''سب جھوٹ ہے سرکار۔ لوگوں نے اس کو ناحق بدنام کیا ہے۔''

''کیا معنی؟ کیا وہ تین بار اپنے شوہروں کے پاس سے نہیں بھاگ آئی؟''

''ان لوگوں نے اُسے نکال دیا تو کیا کرتی؟''

''کیسے احمق آدمی ہو، کوئی اتنی دور سے آ کر شادی کر کے لے جاتا ہے۔ ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے، اس لیے کہ عورت کو نکال دے؟''

گنگو نے شاعرانہ جوش کے ساتھ کہا: ''جہاں محبت نہیں ہوتی ہے ہجور، وہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔ عورت کھالی روٹی کپڑا تو نہیں چاہتی ہے۔ کچھ محبت بھی تو چاہتی ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ہم نے بدھوا سے بیاہ کر کے اس کے اوپر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ چاہتے تھے کہ وہ دل و جان سے اس کی ہو جائے۔ لیکن دوسرے کو اپنا بنانے کے لیے پہلے آپ کو اس کا بن جانا پڑتا ہے۔ ہجور، یہ بات ہے۔ پھر اسے ایک بیماری بھی ہے۔ اسے کوئی بھوت لگا ہوا ہے، وہ کبھی بک جھک کرنے لگتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے۔''

''اور تم ایسی عورت سے شادی کرو گے؟'' میں نے شبہہ کے انداز سے سر ہلا کر کہا: ''سمجھ لو زندگی تلخ ہو جائے گی۔''

گنگو نے شہیدانہ سرگرمی سے کہا: ''میں تو سمجھتا ہوں میری جندگی بن جائے گی۔ آگے بھگوان کی مرجی۔''

میں نے زور دے کر کہا: ''تو تم نے طے کر لیا ہے؟''

''ہاں ہجور۔''

''تو میں تمھارا استعفیٰ منظور کرتا ہوں۔''

میں بے معنی رسوم اور مہمل بندشوں کا غلام نہیں ہوں۔ لیکن جو آدمی ایک فاحشہ سے شادی کر لے اسے اپنے یہاں رکھنا اندیشے سے خالی نہ تھا۔ آئے دن قضیے ہوں گے۔ نئی نئی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ کبھی پولیس تحقیقات کرنے آئے گی، کبھی مقدمے کھڑے ہوں گے۔ کیا عجب ہے چوری کی وارداتیں بھی ہوں۔ گنگو بھوکے آدمی کی طرح روٹی کا ٹکڑا دیکھ کر اس کی طرف لپک رہا ہے۔ روٹی خشک ہے، بدمزہ ہے، اس کی اُسے پروا نہیں۔ اس کا عقلِ سلیم سے کام لینا محال تھا۔ میں نے اس کو علاحدہ کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

(۲)

پانچ مہینے گزر گئے۔ گنگو نے گومتی سے شادی کر لی تھی اور اس محلے میں ایک کھپریل کا مکان لے کر رہتا تھا۔ وہ اب چاٹ کا خوانچہ لگا کر گزر بسر کرتا تھا۔ مجھے جب کبھی بازار میں مل جاتا میں اس سے فوراً استفسار حال کرتا۔ مجھے اس کے حالات سے ایک خاص دلچسپی ہو گئی تھی۔ یہ ایک معاشرتی مسئلے کی آزمایش تھی، معاشرتی ہی نہیں بلکہ نفسیاتی بھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا انجام

کیا ہوتا ہے۔ میں گنگو کو ہمیشہ خوش وخرم دیکھتا۔ فراغت اور بے فکری سے چہرہ پر جو ایک نفاست اور مزاج میں ایک خودداری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مجھے یہاں صریحاً نظر آتی تھی۔ روپے بیس آنے کی بکری ہو جاتی تھی۔ اس میں لاگت نکال کر آٹھ دس آنے بچ جاتے تھے۔ یہی اس کی معاش تھی، مگر اس میں کوئی خاص برکت تھی، کیوں کہ اس طبقے کے آدمیوں میں جو بے سروسامانی، جو بے غیرتی نظر آتی ہے ان سے وہ پاک تھا۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور مسرت کی جھلک تھی جو سکونِ قلب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک دن میں نے سنا کہ گومتی گنگو کے گھر سے بھاگ گئی۔

کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس خبر سے ایک خاص خوشی ہوئی۔ مجھے گنگو کے اطمینان اور پُر عافیت زندگی پر ایک طرح کا رشک آتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کسی رُسوا کن سانحے، کسی دل فگار اور تباہ کن تغیر کا منتظر تھا۔ آخر اسے اپنی سہل اعتقادی کا تاوان دینا پڑا۔ اب دیکھیں وہ کس طرح منہ دکھاتا ہے۔ اب آنکھیں کھلیں گی اور معلوم ہوگا کہ لوگ جو اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کتنے نیک نیت تھے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حضرت کو ایک نایاب چیز ملی جا رہی ہے، گویا نجات کا دروازہ کھل گیا ہے۔ لوگوں نے کتنا سمجھایا، کتنا کہا کہ یہ عورت اعتبار کے قابل نہیں، کتنوں کو دغا دے چکی ہے۔ تمھارے ساتھ بھی دغا کرے گی مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اب اس ابلہانہ ضد کا خمیازہ اُٹھاؤ۔ میں تو ذرا مزاج پُرسی کروں۔ کہوں: ''کیوں مہراج، دیوی جی کا یہ پروان پا کر خوش ہوئے یا نہیں۔ تم تو کہتے تھے وہ ایسی ہے اور ویسی ہے۔ لوگ اسے محض بدخواہی کے باعث تہمت لگاتے ہیں۔ اب بتاؤ کون غلطی پر تھا۔ اب آ گیا خیال شریف میں کہ حسن فروش عورتوں سے لوگ کیوں احتراز کرتے ہیں۔''

اسی دن اتفاق سے بازار میں گنگو سے میری ملاقات ہو گئی۔ بدحواس تھا، بالکل کھویا ہوا، گم گشتہ، کشتی شکستہ۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ندامت سے نہیں، درد سے میرے پاس آ کر بولا: ''بابو جی، گومتی نے میرے ساتھ بھی دغا کی۔''

میں نے حاسدانہ مسرت سے لیکن بظاہر ہمدردی کا اظہار کر کے کہا: ''تم سے تو میں نے پہلے ہی کہا تھا، لیکن تم مانے ہی نہیں۔ اب صبر کرو۔ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ روپے پیسے صاف کر لے گئی یا کچھ چھوڑ گئی؟''

گنگو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ایسا معلوم ہوا گویا میرے اس سوال نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

''ارے بابو جی ایسا نہ کہیے۔ اس نے دھیلے کی چیز بھی نہیں چھوئی۔ اپنا جو کچھ تھا وہ بھی

چھوڑ گئی۔ نہ جانے مجھ میں کیا برائی دیکھی۔ میں اس کے لائق نہ تھا۔ بس اور کیا کہوں۔ وہ پڑھی لکھی، میں کریا اچھر بھینس برابر، میرے ساتھ اتنے دن رہی۔ یہی بہت تھا۔ کچھ دن اور اس کے ساتھ رہ جاتا تو آدمی بن جاتا۔ اس کا آپ سے کہاں تک بکھان کروں بابو جی۔ اوروں کے لیے وہ چاہے کچھ رہی ہو، وہ میرے لیے کسی دیوتا کا آشیر باد تھی۔ کیا جانے مجھ سے ایسی کیا کھتا ہوگئی۔ مگر کسم لے لیجیے جو اس نے بھول کر بھی شکایت کی ہو۔ میری اوکات ہی کیا ہے بابو جی۔ دس بارہ آنے روز کا مجور ہوں، مگر اسی میں اس کے ہاتھوں اتنی برکت تھی کہ کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ کبھی میں نے اس کے چہرے پر میل نہیں دیکھا۔''

مجھے ان الفاظ سے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سمجھا تھا وہ اس کی بے وفائی کی داستان کہے گا اور میں اس کی حماقت پر حاسدانہ ہمدردی کروں گا۔ اس احمق کی آنکھیں اب تک نہیں کھلیں اب بھی اسی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ ضرور اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔

میں نے شماتت آمیز ظرافت شروع کی: ''تو وہ تمھارے گھر سے کچھ نہیں لے گئی؟''

''کچھ نہیں بابو جی، دھیلے کی چیز بھی نہیں۔''

''اور تم سے محبت بھی بہت کرتی تھی؟''

''اب آپ سے کیا کہوں بابو جی، وہ محبت تو مرتے دم تک یاد رہے گی۔''

''پھر بھی تمھیں چھوڑ کر چلی گئی؟''

''یہی تو تعجب ہے بابو جی۔''

''تریا چرتر کا نام کبھی سنا ہے؟''

''ارے بابو جی! ایسا نہ کہیے۔ میری گردن پر کوئی چھری بھی رکھ دے تو بھی میں اس کا جس ہی گائے جاؤں گا۔''

''تو پھر ڈھونڈ نکالو۔''

''ہاں مالک! جب تک اُسے ڈھونڈ نہ لاؤں، مجھے چین نہ آئے گا۔ مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے، پھر تو میں اسے لے ہی آؤں گا اور بابو جی! میرا دل کہتا ہے کہ وہ آئے گی جرور، دیکھ لیجیے گا وہ مجھ سے خفا نہیں تھی۔ لیکن دل نہیں مانتا۔ جاتا ہوں مہینے دو مہینے جنگل پہاڑ کی خاک چھانوں گا۔ جیتا رہا تو آپ کے درسن کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ مجنونانہ رفتار سے ایک طرف چل دیا۔

(۳)

اس کے بعد مجھے ایک ضرورت سے نینی تال جانا پڑا تفریح کے لیے۔ ایک مہینے کے بعد

لوٹا اور ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ دیکھتا ہوں گنگو ایک نوزائیدہ بچے کو گود میں لیے کھڑا ہے۔ شاید کرشن کو پا کر نند بھی اتنے باغ باغ نہ ہوئے ہوں گے۔ معلوم ہوتا تھا مسرت اس کے جسم سے باہر نکلی پڑتی ہے۔ چہرے اور آنکھوں سے تشکر اور نیاز کے نغمے سے نکل رہے تھے۔ کچھ وہی کیفیت تھی جو کسی فاقہ کش سائل کے چہرے پر شکم سیر ہو جانے کے بعد نظر آتی ہے۔

میں نے پوچھا: ''کہو مہراج، گومتی دیوی کا کچھ سراغ ملا؟ تم تو باہر گئے تھے۔''

گنگو نے جامے میں پھولے نہ سماتے ہوئے جواب دیا: ''ہاں بابو جی، آپ کی دعا سے ڈھونڈ لایا۔ لکھنؤ کے زنانے ہسپتال میں ملی۔ یہاں ایک سہیلی سے کہہ گئی تھی کہ اگر وہ بہت بے قرار ہوں تو بتلا دینا۔ میں سنتے ہی لکھنؤ بھاگا اور انھیں لے آیا۔ گھاتے میں یہ بچہ بھی مل گیا۔''

اس نے بچے کو گود میں میری طرف بڑھایا گویا کوئی کھلاڑی تمغہ پا کر اسے دکھا رہا ہو۔

میری حیرت کی انتہائی نہ رہی۔ ابھی اس کی شادی کو ہوئے کل چھ مہینے ہوئے ہیں پھر بھی یہ بچے کو کتنی بے حیائی سے دکھا رہا ہے۔ میں نے تمسخر کے انداز سے پوچھا: ''اچھا یہ لڑکا بھی مل گیا۔ شاید اسی لیے وہ یہاں سے بھاگی تھی۔ ہے تمھارا ہی لڑکا نہ؟''

''میرا کاہے کو ہے بابو جی، آپ کا ہے، بھگوان کا ہے۔''

''تو لکھنؤ میں پیدا ہوا؟''

''ہاں بابو جی، ابھی تو ایک مہینے کا ہے۔''

''تمھاری شادی ہوئے کتنے دن ہوئے؟''

''یہ ساتواں مہینہ جا رہا ہے۔''

''شادی کے چھٹے مہینے میں پیدا ہوا؟''

''اور کیا بابو جی۔''

''پھر بھی تمھارا لڑکا ہے؟''

''ہاں جی۔''

''کیسی بے سر پیر کی باتیں کر رہے ہو؟''

معلوم نہیں وہ میرا منشا سمجھ رہا تھا۔ اسی سادہ لوحانہ انداز سے بولا: ''گھر میں مرتے مرتے بچی۔ بابو جی، یہ نیا جنم ہوا۔ تین دن تین رات چھٹ پٹاتی رہی۔ کچھ نہ پوچھیے۔''

میں نے اب کی ذرا طنز کے ساتھ کہا: ''لیکن چھ مہینے میں لڑکا ہوتے میں نے آج ہی سنا۔''

یہ کنایہ نشانہ پر جا بیٹھا۔ عذرت آمیز تبسم کے ساتھ بولا: ''مجھے تو بابو جی اس کا خیال بھی

نہیں آیا۔ اسی لاج سے تو گومتی بھاگی تھی۔'' میں نے کہا: ''گومتی اگر تمھارا دل مجھ سے نہیں ملتا ہے تو مجھے چھوڑ دو۔ میں اسی دم چلا جاؤں گا۔ اور پھر کبھی تمھارے پاس نہ آؤں گا۔ مجھے تم سے کوئی ملال نہیں ہے۔ تم میری نجر میں اب بھی اتنی ہی بھلی ہو۔ اب بھی میں تمھیں اتنا ہی چاہتا ہوں۔ نہیں اب میں تمھیں اور زیادہ چاہتا ہوں، لیکن اگر تمھارا دل مجھ سے پھر نہیں گیا ہے تو میرے ساتھ چلو۔ گنگو جیتے جی تم سے بے وپھائی نہیں کرے گا۔ میں نے تم سے اس لیے بیاہ نہیں کیا کہ تم دیوی ہو بلکہ اس لیے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں اور سمجھتا تھا کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو۔ یہ بچہ میرا ہے، میرا اپنا بچہ ہے۔ میں نے ایک بویا ہوا کھیت لیا تو کیا اس کی پھسل کو اس لیے چھوڑ دوں گا کہ اسے کبھی کسی دوسرے نے بویا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ مارا۔

میں کپڑے اتارنا بھول گیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ کیوں میری آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے میری دلی کراہت کے باوجود میرے ہاتھوں کو بڑھا دیا۔ میں نے اس معصوم بچے کو گود میں لے لیا اور اس پیار سے اس کا بوسہ لیا کہ شاید اپنے بچوں کا کبھی نہ لیا ہوگا۔

گنگو بولا: ''بابو جی، آپ بڑے شریف ہیں۔ میں گومتی سے برابر آپ کا بکھان کیا کرتا ہوں۔ کہتا ہوں چل ایک بار ان کے درسن کر آ۔ لیکن مارے سرم کے آتی ہی نہیں۔''

میں اور شریف! اپنی شرافت کا پردہ آج میری نظروں سے ہٹا۔ میں نے عقیدت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا: ''نہیں جی، وہ میرے جیسے سیاہ دلوں کے پاس کیا آئیں گی۔ چلو میں ان کے درشن کرنے چلتا ہوں۔ تم مجھے شریف سمجھتے ہو۔ میں ظاہر میں شریف مگر دل کا کمینہ ہوں۔ اصلی شرافت تم میں ہے اور یہ معصوم بچہ وہ پھول ہے جس سے تمھاری شرافت کی مہک نکل رہی ہے۔''

میں بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے گنگو کے ساتھ چلا۔

☆☆☆

بدنصیب ماں

(۱)

پنڈت اجودھیا ناتھ کا انتقال ہوا تو سب نے کہا: ''ایشور آدمی کو ایسی ہی موت دے۔'' چار جوان لڑکے یادگار چھوڑے اور ایک لڑکی۔ اثاثہ بھی کافی۔ پختہ مکان، دو باغ، کئی ہزار کے زیور اور بیس ہزار نقد۔ بیوہ پھول متی کو صدمہ ہونا تو لازمی تھا۔ اور وہ کئی دن تک بے حال رہی۔ لیکن جو ان بیٹوں کو سامنے دیکھ کر اُسے تشفی ہوئی۔ چاروں لڑکے ایک سے ایک سعادت مند، چاروں بہوئیں ایک سے ایک فرماں بردار۔ جس وقت پھول متی چارپائی پر لیٹتی تو باری باری سے اس کے پانو دباتیں۔ وہ اشنان کر کے اٹھتی تو اس کی ساری دھوتیں۔ سارا گھر اس کے اشارے پر چلتا تھا۔ بڑا لڑکا کامتا ناتھ ایک دفتر میں پچاس روپے کا نوکر تھا۔ دوسرا اُماناتھ ڈاکٹری پاس کر چکا تھا اور کہیں مطب کھولنے کی فکر میں تھا۔ تیسرا دیا ناتھ بی۔ اے میں فیل ہو گیا تھا اور اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنا جیب خرچ نکال لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا سیتا ناتھ چاروں میں ذہین اور ہونہار تھا اور امسال بی۔ اے اول درجے میں پاس کر کے ایم۔ اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ کسی میں وہ لا اُبالیاں نہ تھیں، نہ فضول خرچیاں، نہ کم اندیشیاں جو والدین کو جلاتی ہیں اور خاندان کو تباہ کرتی ہیں۔ بڑھیا گھر کی مالکن تھی، اگرچہ کنجیاں بڑی بہو کے پاس رہتی تھیں۔ پھول متی میں وہ حکومت پسندی نہ تھی جو بڑھاپے کو سخت گیر بنا دیا کرتی ہے۔ مگر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکا ناشتہ نہیں منگا سکتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پنڈت جی کو مرے آج بارہواں دن تھا۔ کل تیرہویں ہے۔ برہم بھوج ہوگا۔ برادری کی دعوت ہوگی۔ اسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پھول متی حجرے میں بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ پلّے دار بوروں میں آٹا لا کر رکھ رہے ہیں۔ گھی کے ٹین آ رہے ہیں۔ سبزی کے ٹوکرے، شکر کی بوریاں، دہی کی مٹکیاں سب چلی آ رہی ہیں۔ مہابرہمن کے لیے دان کی چیزیں لائی گئیں۔ برتن، پلنگ، بستر، کپڑے وغیرہ مگر پھول متی کو کوئی چیز نہیں دکھائی گئی۔ حسبِ ضابطہ سب چیزیں اس کے پاس آنی چاہیے تھیں۔ وہ ہر ایک چیز کو دیکھتی، انھیں پسند کرتی، ان کی مقدار میں کمی بیشی کرتی، تب ان چیزوں کو بھنڈارے میں رکھا جاتا۔ مگر اسے دکھانے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔ اچھا! اور آٹا

تین ہی بوری کیوں آیا۔ اس نے تو پانچ بوریوں کے لیے کہا تھا۔ گھی کے بھی پانچ کنستر آئے۔ اس نے دس کنستر منگوائے تھے۔ شاید سبزی، دہی، شکر وغیرہ میں بھی کمی کی گئی ہوگی۔ کس نے اس کے حکم میں مداخلت کی۔ جب اس نے بات طے کردی تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ آج چالیس سال سے گھر کے ہر ایک معاملے میں پھول متی کا فیصلہ ناطق تھا۔ اس نے سو کہا تو سو خرچ کیے گئے۔ ایک کہا تو ایک۔ کسی نے مین میکھ نہ کی۔ یہاں تک کہ پنڈت اجودھیا ناتھ سب کچھ اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے۔ پر آج اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی خلاف ورزی کی جارہی ہے، وہ اسے کیوں کر برداشت کرسکتی تھی۔

وہ کچھ دیر تک تو ضبط کیے بیٹھی رہی۔ پر آخر اس سے نہ رہا گیا۔ خود پروری اس کی فطرتِ ثانی بن گئی تھی۔ غصے میں بھری ہوئی آئی اور کامتا ناتھ سے بولی: ''کیا آٹا تین بورے لائے، میں نے پانچ بوروں کے لیے کہا تھا اور گھی بھی پانچ کنستر۔ تمھیں یاد ہے میں نے دس کنستر کہے تھے۔ کفایت کو میں بُرا نہیں کہتی لیکن جس نے یہ کنواں کھودا اس کی آتما پانی کو ترسے تو کتنے شرم کی بات ہے۔''

کامتا ناتھ نے معذرت نہیں کی۔ عذرِ گناہ نہیں کیا۔ نادم بھی نہیں ہوا۔ فوراً تقصیر کی تلافی کرنے نہیں دوڑا۔ ایک منٹ تو باغیانہ انداز سے کھڑا رہا۔ پھر بولا: ''ہم لوگوں کی صلاح تین ہی بوروں کی ہوئی اور تین بوروں کے لیے پانچ کنستر گھی کافی تھا۔ اسی حساب سے اور چیزیں بھی کم کردی گئیں۔''

پھول متی تیز ہوکر بولی: ''کس کی رائے سے آٹا کم کیا گیا؟''

''ہم لوگوں کی رائے سے۔''

''تو میری رائے کوئی چیز نہیں ہے؟''

''ہے کیوں نہیں۔ لیکن اپنا نفع نقصان تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔''

پھول متی ہکا بکا ہوکر اس کا منہ تکنے لگی۔ اس جملے کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا، اپنا نفع نقصان۔ یہ ''اپنا'' کیا بلا ہے؟ اس کا وجود کب سے ہوا؟ اس گھر کے نقصان کی ذمہ داری اس کے سر ہے، دوسروں کو، خواہ وہ اس کے پیٹ کے لڑکے ہی کیوں نہ ہوں، اس کے فیصلے میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ لونڈا اس طرح جواب دے رہا ہے گویا گھر اس کا ہے۔ اس نے مرمر کر یہ گرہستی جمع کی ہے۔ میں تو غیر ہوں، ذرا اس کی خودسری تو دیکھو۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا: ''میرے نفع نقصان کے ذمہ دار تم نہیں ہو۔ مجھے اختیار ہے میں جو مناسب سمجھوں وہ کروں۔ ابھی جاکر دو بورے آٹا اور پانچ کنستر گھی اور لاؤ اور آیندہ سے خبردار جو کسی نے میری بات کاٹی۔''

اس نے اپنے خیال میں ضرورت سے زیادہ تنبیہ کردی تھی اور اب وہاں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ سمجھ کر وہ اپنے حجرے میں چلی آئی۔ حالانکہ کامتا ناتھ ابھی وہیں کھڑا تھا اور اس کے چہرے سے ایسا مترشح ہو رہا تھا کہ اسے اس حکم کی تعمیل میں کچھ عذر ہے، مگر پھول متی مطمئن بیٹھی تھی۔ اتنی تنبیہ پر بھی کسی کو اس کی نافرمانی کی جرأت ہو سکتی ہے، یہ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ مگر رفتہ رفتہ اس پر اب حقیقت کھلنے لگی تھی کہ اس کے گھر میں اس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو دس بارہ روز پہلے تھی۔ رشتہ داروں کے یہاں سے نوید میں گھی، شکر، مٹھائی وغیرہ آ رہی تھی۔ بڑی بہو ان چیزوں کو خاص انداز سے سنبھال سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ تینوں چھوٹی بہوئیں بھی بھنڈارے میں گھسی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی پھول متی سے پوچھنے نہیں آتا۔ برادری کے لوگ بھی جو کچھ پوچھتے ہیں وہ کامتا ناتھ سے یا بڑی بہو سے۔ کامتا ناتھ کہاں کا بڑا مہتمم ہے، دن بھر بھنگ پیے پڑا رہتا ہے اور بڑی بہو جیسی پھوہڑ عورت بھلا ان باتوں کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ بھد ہوگی اور کیا۔ سب کے سب خاندان کی ناک کٹوائیں گے۔ وقت پر کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جائے گی تب ادھر ادھر بھاگے پھریں گے۔ ان کاموں کے لیے بڑا تجربہ اور سلیقہ چاہیے۔ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ بن جائے گی اور ماری ماری پھرے گی۔ کوئی چیز اتنی کم بنے گی کہ کسی پتل پر پہنچے گی، کسی پر نہیں۔ آخر ان سبھوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اچھا بڑی بہو سیف کیوں کھول رہی ہے۔ وہ سیف کو میری مرضی کے بغیر کھولنے والی کون ہوتی ہے؟ کنجی اس کے پاس ہے ضرور، لیکن جب تک میں روپے نہ نکلواؤں وہ صندوق نہیں کھول سکتی، آج اس طرح کھول رہی ہے گویا سب کچھ وہی ہے میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ اس نے بڑی بہو کے پاس جا کر تند لہجے میں کہا: ''سیف کیوں کھولتی ہو بہو؟ میں نے تو کھولنے کو نہیں کہا۔''

بڑی بہو نے بے باکانہ انداز سے کہا: ''بازار سے سامان آیا ہے تو دام نہ دیا جائے گا؟ کون چیز کس بھاؤ سے آئی ہے اور کتنی آئی ہے مجھے کچھ معلوم نہیں جب تک حساب کتاب نہ ہو جائے روپے کیسے دیے جائیں؟''

''حساب کتاب سب ہو گیا ہے۔''

''کس نے کیا؟''

''اب میں کیا جانوں جا کر اپنے لڑکوں سے پوچھو۔''

پھول متی پھر آ کر اپنی کوٹھری میں بیٹھ گئی۔ اس وقت بگڑنے کا موقع نہ تھا۔ گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت اس نے لڑکوں کو ڈانٹا تو لوگ یہی تو کہیں گے کہ پنڈت کے مرتے ہی ان کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی۔ خون کا گھونٹ پی پی کر رہ جاتی ہے، جب مہمان رخصت ہو جائیں تب وہ ایک ایک کی خبر لے گی۔ دیکھے گی اس وقت لڑکے کیا باتیں بناتے ہیں۔ اس عرصے

میں وہ کار پردازوں کی بے قاعدگیوں اور فضول کاریوں اور غلطیوں کا مبصرانہ نگاہوں سے مشاہدہ کررہی تھی۔ بارہ بجتے بجتے دعوت شروع ہوئی۔ ساری برادری کے لوگ یک بارگی کھانے کے لیے بلا لیے گئے۔ پھول متی کھڑی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ صحن میں مشکل سے ڈھائی سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ساری برادری کیسے بیٹھے گی۔ دو پنکتوں میں لوگ بیٹھتے تو کیا برا تھا۔ یہی تو ہوتا دو کی جگہ چار بجے ختم ہوتی۔ مگر یہاں تو سب کو سونے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔

دفعتاً شور مچا۔ ''ترکاریوں میں نمک نہیں۔''

بڑی بہو جلدی سے نمک پیسنے گئی۔ پھول متی غصے سے ہونٹ چبا رہی تھی مگر اس موقع پر زبان نہ کھول سکتی تھی۔ بارے نمک پسا اور پتیلیوں میں ڈالا گیا۔

یکا یک پھر شور مچا۔ ''پانی گرم ہے۔''

گھر میں برف نہ تھی۔ آدمی بازار دوڑا گیا۔ بازار میں اتنی رات گئے برف کہاں، آدمی ناکام لوٹ آیا۔ مہمانوں کو وہی نل کا گرم پانی پینا پڑا۔ پھول متی کا بس چلتا تو لڑکوں کا منہ نوچ لیتی۔ ایسی بدانتظامی اس کے گھر میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس پر سب کو مالک اور منتظم بننے کی دھن ہے۔ برف جیسی ضروری چیز منگوانے کی کسی کو بھی سدھ نہ رہی۔ سدھر کہاں سے آئے جب کسی کو گپ مارنے سے فرصت نہ ملے۔ مہمان اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ دعوت کرنے چلے تھے اور گھر میں برف تک نہیں۔ اچھا پھر کیوں گھر میں ہل چل مچی؟ ارے غضب! کسی کے شوربے میں ایک مری چوہیا نکل آئی۔ یا بھگوان؟ اب تمھیں آبرو رکھیو۔ چھی! اس پھوہڑپن کی بھی کوئی حد ہے۔ سارے مہمان اٹھے جا رہے ہیں۔ نہ اٹھیں تو کیا کریں۔ آنکھوں سے دیکھ کر مکھی کون نگلے گا۔ پھول متی کے دل میں ایسا ابال اٹھ رہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا لے۔ مجنونانہ حالت میں بار بار سر کے بال نوچتی تھی۔ ابھاگے دعوت کا انتظام کرنے چلے تھے۔ سارا کرا دھرا مٹی میں مل گیا۔ سیکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ بدنامی ہوئی وہ الگ۔ اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ مہمان اُٹھ چکے تھے۔ پتّلوں میں کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ چاروں لڑکے آنگن میں نادِم کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو الزام دے رہا تھا۔ بڑی بہو دیورانیوں پر بگڑ رہی تھیں۔ اسی وقت پھول متی شعلے کی طرح ٹوٹ کر آئی اور بولی:

''منہ میں کالک لگ گئی کہ نہیں؟ یا ابھی کچھ کسر ہے۔ ڈوب مرو سب کے سب جا کر چلّو بھر پانی میں۔ شہر میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ ہفتوں اس دعوت کا چرچا رہے گا۔ مذاق اڑایا جائے گا۔ تم لوگوں کو کچھ شرم وحیا تو ہے نہیں، تمھیں کیا، آتما تو اس کی رو رہی ہے جس نے زندگی کو گھر کی آبرو بنانے میں تباہ کر دیا۔''

کامنا ناتھ کچھ دیر تو کھڑا سنتا رہا۔ آخر جھنجھلا کر بولا: ''اچھا اب رہنے دو اماں۔ غلطی

ہوئی۔ ہم سب مانتے ہیں بہت بڑی غلطی ہوئی، لیکن اب کیا اس کے لیے آدمیوں کو حلال کر ڈالوگی؟ سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں، پچھتانے کے سوا آدمی اور کیا کرتا ہے۔ کسی کی جان تو نہیں ماری جاتی۔ آدمی غلطیوں ہی سے سیکھتا بھی تو ہے۔''

بڑی بہو نے فرمایا: ''ہم کیا جانتے تھے کہ بی بی (نند کملا) سے اتنا ذرا سا کام نہ ہوگا۔ چوہیا ترکاری میں بیٹھی ہوگی۔ انھوں نے ٹوکری کو بغیر دیکھے بھالے کڑھاؤ میں ڈال دیا۔''

کامتاناتھ نے بیوی کو ڈانٹا: ''اس میں نہ کملا کا قصور ہے، نہ تمھارا، نہ میرا۔ اتفاق ہے۔ اتنے بڑے بھوج میں ایک ایک مٹھی ترکاری کڑھاؤ میں نہیں ڈالی جاتی۔ ٹوکرے کے ٹوکرے انڈیل دیے جاتے ہیں۔ اس میں کیسی جگ ہنسائی اور کیسی نک کٹائی۔ تم خواہ مخواہ جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔''

پھول متی: ''شرماتے تو نہیں۔ اُلٹے اور بے حیائی کی باتیں کرتے ہو۔''

کامتا: ''شرماؤں کیوں۔ کسی کی چوری کی ہے؟ چینی میں چیونٹے اور آٹے میں گھن یہ سب تو نہیں دیکھے جاتے۔ ہماری نگاہ نہ پڑی۔ بس یہی بات بگڑ گئی۔ ورنہ چپکے سے چوہیا پکڑ کر نکال دیتے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔''

پھول متی اس کفر پر استعجاب سے بولی: ''کیا سب کو چوہیا کھلا کر ان کا دھرم لے لیتا؟''

کامتاناتھ ماں کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر بولا: ''کیا پرانے زمانے کی باتیں کر رہی ہو اماں۔ ان باتوں سے دھرم نہیں جاتا۔ یہ دھرم ماتما لوگ جو پتل سے اٹھ اٹھ کر گئے ہیں ان میں ایسا کون ہے جو بھیڑ بکری کا گوشت نہ کھاتا ہو۔ تالاب کے کچھوے اور گھونگے تک تو کسی سے بچتے نہیں۔ کیا وہ ذرا سی چوہیا ان سب سے ناپاک ہے۔''

پھول متی کے پاس ایسی کٹھ حجتیوں کا جواب نہ تھا۔ اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔

(۲)

دو مہینے گزر گئے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ چاروں بھائی بھنگ پی کر کمرے میں بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں۔ بڑی بہو بھی اس مجلس میں شریک ہیں۔

کامتاناتھ نے مسند پر ٹک کر کہا: ''میں تو کمد کی شادی میں اپنے حصے کی ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔ آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں۔''

اماناتھ: ''تو یہاں کس کے پاس فالتو روپے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار ہی تو ایک ایک کے حصے میں آتے ہیں۔ مجھے اپنا میڈیکل ہال کھولنے کے لیے کم از کم پانچ ہزار کی ضرورت ہے۔''

دیاناتھ: ''مجھے بھی پریس اور اخبار کی فکر ہے۔ پانچ ہزار اپنے ہوں گے تو پانچ ہزار کا کوئی ساجھی

اور مل جائے گا۔ میں تو اپنے روپے میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔''

کامتا: ''دادا نے پانچ ہزار جہیز ٹھہرایا تھا۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پنڈت مراری لال کے لڑکے سے شادی ہو۔ لڑکی قسمت والی ہو تو غریب گھر میں بھی رہ سکتی ہے۔ بدنصیب ہو تو راجا کے گھر میں روتی رہے گی۔ یہ تو نصیبوں کا کھیل ہے۔''

سیتا نے شرماتے ہوئے کہا: ''یہ تو مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ طے کی ہوئی سگائی توڑ دی جائے۔ ان سے کہا جائے کہ پانچ ہزار کی جگہ تین ہزار لے لیں۔ اس طرح پانچ ہزار میں شادی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے حصے کے سب روپے دے دوں گا۔''

کامتا ناتھ نے کھسیا کر بھائیوں سے کہا: ''سنتے ہو اس کی باتیں۔''

اُما: ''جب ٹھوکریں کھائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔''

کامتا: ''اتنا یاد رکھو کہ ہم لوگ تمھاری تعلیم کے ذمہ دار نہیں ہیں۔''

سیتا: ''جی ہاں۔ یاد ہے۔''

اُما: ''اور جو کہیں تمھیں ولایت جا کر پڑھنے کے لیے کل وظیفہ مل جائے تو سوٹ بوٹ اور سفر خرچ کے لیے روپیا کہاں سے لاؤ گے؟ اس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے؟''

کامتا: ''اور وظیفہ تمھیں ملے گا۔ کہو میں آج لکھ دوں۔''

اس دلیل سے سیتا ناتھ کو بھی توڑ لیا۔ فی الواقعہ اگر اسے سرکاری وظیفہ مل گیا تو چار پانچ ہزار تیاریوں کے لیے درکار ہوں گے۔ کمد کے لیے وہ اتنی بڑی قربانی ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پامال کرے۔ بولا: ''ہاں ایسی حالت میں تو مجھے بھی روپے کی ضرورت پڑے گی۔''

کامتا: ''تو اس کی ایک صورت یہی ہے کہ کمد کی شادی کم سے کم خرچ میں کر دی جائے۔ ایک ہزار سے زیادہ ہم کسی طرح خرچ نہیں کر سکتے۔''

''پنڈت دین دیال کیسے رہیں گے؟ ایم۔اے، بی۔اے نہ سہی ججمانی سے ان کی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں۔ عمر بھی ابھی چالیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ پچھلے سال ہی تو بیوی مری ہے۔ مجھے یقین ہے وہ بغیر جہیز کے راضی ہو جائیں گے۔''

کامتا: ''یہ نہ کہو۔ وہ آج چاہیں تو ہزار دو ہزار پا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ کچھ دب جائیں گے۔ تو یہی صلاح کہ مراری لال کو جواب دیا جائے اور دین دیال کے ساتھ سگائی کی جائے۔''

دیا: ''اماں سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔''

کامتا: ''اماں سے پوچھنا بے کار ہے۔ان کی تو جیسے عقل گھاس کھا گئی ہے۔وہی پرانے وقتوں کی باتیں! مراری لال کے نام پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ زمانہ نہیں رہا۔''

اُما: ''وہ مانیں گی نہیں۔اپنے زیور بیچ کر شادی کریں گی۔دیکھ لیجیے گا۔''

کامتا: ''ہاں یہ ممکن ہے۔زیوروں پر ان کا پورا اختیار ہے۔یہ ان کا استری دھن ہے۔وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں۔''

دیاناتھ: ''استری دھن ہے تو کیا اسے لٹا دیں گی؟ آخر وہ بھی تو دادا ہی کی کمائی ہے۔''

کامتا: ''کسی کی کمائی ہو۔استری دھن عورت کی چیز ہے۔''

اُما: ''یہ سب قانونی گورکھ دھندے ہیں۔استری دھن کوئی چیز نہیں۔گہنے دس ہزار سے کم کے نہیں ہیں۔اتنی بڑی رقم ہم کھو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔کسی بہانے سے یہ گہنے اپنے ہاتھ میں کرنے ہوں گے۔ابھی دین دیال کا ذکر نہ کرو ورنہ تاڑ جائیں گی۔گہنے اپنے پاس آ جائیں تو صاف صاف کہہ دو۔تب کیا کر لیں گی۔''

دیا: ''ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔''

کامتا: ''مجھے دھوکے کی چال مناسب نہیں معلوم ہوتی۔جس پر ہمارا حق ہے اس کے لیے ہم لڑ سکتے ہیں۔جس پر ہمارا حق نہیں اس کے لیے ہم دھوکا دھڑی نہیں کر سکتے۔''

دیاناتھ: ''تو آپ الگ بیٹھیے۔میں جا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک اخبار میں مضمون لکھا تھا اس پر سرکار مقدمہ چلا رہی ہے۔پانچ ہزار کی ضمانت دینی پڑے گی۔آپ اپنے زیور دے دیں تو میری جان بچ جائے گی۔آپ لوگ بھی کچھ نمک مرچ ملا دیجیے گا۔''

کامتا: ''نا بھیا، میں اس کام کے قریب نہ جاؤں گا۔''

سیتا: ''میرا بھی استعفیٰ ہے۔''

اُما: ''ان لوگوں کو جانے دو جی۔ہم اور تم مل کر رنگ جما لیں گے۔یہ دھرماتما لوگ ہیں۔بھیا نوکر ہی ہیں۔سیتا کو وظیفہ ملنے والا ہے۔ضرورت تو ہمیں اور تمھیں ہے۔''

بڑی بہو نے فرمایا: ''پچاس روپے کے ہی تو نوکر ہیں یا اور کچھ۔اتنے دن مجھے آئے ہو گئے، پیتل کا ایک چھلا بھی نہ بنوایا۔توفیق ہی نہ ہوئی۔آج دھرماتما بنے ہیں۔''

اُما: ''اماں کے زیور مل جائیں گے تو ان کا ہار تمھیں دے دوں گا۔بھائی خاطر جمع رکھو۔''

بڑی بہو: ''مل چکے، وہ گڑ نہیں جو چینٹے کھا جائیں۔''

دیا: ''اچھا تو اسی بات پر ابھی جاتا ہوں۔ زیور لے کر نہ آجاؤں تو منہ نہ دکھاؤں۔''

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیا ناتھ کی کوڑی چت پڑی۔ ماں کا مامتا بھرا دل بیٹے کی مصیبت دیکھ کر کیوں نہ پسیجتا۔ پھول متی یہ داستان سنتے ہی باؤلی ہوگئی۔ اس پر اُماناتھ نے اور بھی روڑا جمایا: ''اگر صبح دس بجے تک روپے داخل نہ ہوئے تو ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ بنک سے روپے تو ابھی مل نہیں سکتے۔ مہینوں خط و کتابت ہوگی۔ وراثت کا فیصلہ ہو جائے گا، تب کہیں جا کر روپے ملیں گے۔''

پھول متی کو یہ کب برداشت ہو سکتا تھا کہ اس کے زیوروں کے ہوتے اس کے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔ سارے زیور نکال کر دیا ناتھ کو دے دیے۔

اس طرح اپنی ماں کی گردن پر خنجر چلا کر دونوں ناخلف خوش خوش بھائیوں کے پاس لوٹ آئے۔

(۳)

دو تین مہینے اور گزر گئے۔ زیوروں پر تصرف کر کے چاروں بھائی اب ماں کی دلجوئی کرنے لگے۔ اپنی بیویوں کو سمجھاتے رہتے کہ اماں کا دل نہ دکھائیں۔ اگر اس کی تشفی تھوڑی سی ظاہر داری سے ہو جاتی ہے تو اس میں کیوں کمی کی جائے۔ چاروں کرتے اپنے دل کی مگر ماں سے صلاح لے لیتے یا ایسا جال پھیلاتے کہ وہ ان کی باتوں میں آجاتی اور ہر ایک بات میں رضامند ہو جاتی۔ باغ کا فروخت کرنا اسے بہت ناگوار گزرتا تھا، لیکن چاروں نے ایسی بندشیں باندھیں کہ وہ اسے بیع کرنے پر راضی ہوگئی، ہاں کمد کی شادی کے معاملے میں بیٹوں سے اس کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ کہتی تھی کہ شادی مراری لال کے لڑکے سے ہی ہوگی۔ چاروں بھائی پنڈت دین دیال سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس بات پر تکرار کی نوبت آگئی۔

پھول متی نے کہا: ''ماں باپ کی کمائی میں کیا بیٹی کا حصہ نہیں ہے؟ تمھیں دس ہزار کا ایک باغ ملا۔ پچیس ہزار کا مکان، بیس ہزار نقد میں سے کیا پانچ ہزار بھی کمد کا حصہ نہیں ہے؟''

کامتاناتھ نے نرمی سے کہا: ''اماں! کمد ہماری بہن ہے اور ہم اپنے مقدور بھر کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے اسے نقصان ہو، لیکن حصے کی جو بات کہتی ہو تو کمد کا حصہ کچھ نہیں ہے۔ دادا جب زندہ تھے تب اور بات تھی۔ اب تو ہمیں ایک ایک پیسے کی کفایت کرنا پڑے گی۔ جو کام ایک ہزار سے ہو جائے اس کے لیے پانچ ہزار خرچ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟''

اُماناتھ نے تصحیح کی: ''پانچ ہزار کیوں صاحب۔ دس ہزار کہیے۔ دعوت، ضیافت، رسم، رسوم میں کیا پانچ ہزار بھی خرچ نہ ہوں گے۔''

کامتا: ''ہاں ٹھیک ہے۔ دس ہزار ہی سمجھو۔ دس ہزار روپے ایک شادی میں خرچ کرنے کی اب ہماری حیثیت نہیں ہے۔''

پھول متی نے ضد پکڑ کر کہا: ''شادی تو مراری لال کے لڑکے سے ہی ہوگی۔ چاہے پانچ ہزار خرچ ہوں، چاہے دس ہزار۔ میرے شوہر کی کمائی ہے۔ میں نے مرمر کر جوڑا ہے۔ اپنی مرضی سے خرچ کروں گی۔ تم سے مانگنے جاؤں تو مت دینا۔''

کامتاناتھ کو اب تلخ حقیقت کے اظہار کے سوا چارہ نہ رہا بولے: ''اماں تم خواہ مخواہ بڑھاتی ہو۔ جس روپے کو اب تم اپنا سمجھتی ہو وہ تمھارا نہیں ہے۔ وہ ہمارا ہے۔ ایک ایک پائی ہماری ہے۔ تم ہماری مرضی کے بغیر اس میں سے خرچ نہیں کرسکتیں۔''

پھول متی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ بولی: ''کیا کہا؟ پھر تو کہنا۔ میں اپنے ہی روپے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کرسکتی؟''

کامتا: ''وہ روپے تمھارے نہیں ہمارے ہیں؟''

پھول متی: ''تمھارے ہوں گے لیکن میرے مرنے کے بعد۔''

کامتا: ''نہیں دادا کے مرتے ہی سب کچھ ہمارا ہوگیا۔''

اُما: ''اماں قانون تو جانتی نہیں۔ خواہ مخواہ الجھتی ہیں۔''

پھول متی کی بے نور آنکھیں شعلے کی طرح دہک اٹھیں۔ چہرہ لال ہوگیا۔ بولی: ''تمھارا قانون بھاڑ میں جائے۔ ایسے قانون میں آگ لگے۔ میں ایسے لچر قانون کو نہیں مانتی۔ یہ قانون ہے کہ گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ تمھارے دادا ایسے کوئی دھنا سیٹھ نہ تھے۔ میں نے پیٹ اور تن کاٹ کاٹ کر یہ روپے جمع کیے ہیں۔ نہیں تو آج اس گھر میں دھول اڑتی ہوتی۔ گھر ہی کہاں ہوتا۔ میرے جیتے جی تم میرے روپے چھو نہیں سکتے۔ میں نے تم چاروں کی شادی میں دس دس ہزار خرچ کیے ہیں۔ تمھاری پڑھائی میں بھی پانچ پانچ ہزار سے کم خرچ نہ ہوئے ہوں گے۔ کمد بھی تو میرے ہی پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی شادی میں بھی دس ہزار خرچ کروں گی۔ جو کچھ بچے گا، وہ تم لے لینا۔''

اُماناتھ نے جھلا کر کہا: ''بھائی صاحب! آپ ناحق اماں کے منہ لگتے ہیں۔ چل کر مراری لال کو خط لکھ دیجیے۔ تمھارے ہاں شادی نہ ہوگی۔ دین دیال کے پاس آج ہی پیغام بھیج دیجیے۔ اماں کو بکنے دیجیے۔ یہ قانون قاعدہ تو جانتی نہیں۔ بیکار بحث کرتی ہیں۔''

پھول متی نے ضبط کر کے کہا: ''اچھا کیا قانون ہے۔ ذرا میں بھی سنوں۔''

اُما: ''قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جایداد بیٹوں کی ہوجاتی ہے۔ ماں کا حق صرف گزارہ لینے کا ہے۔''

پھول متی نے پوچھا: ''کس نے بنایا ہے ایسا قانون؟''

اُما: ''ہمارے رشیوں نے، مہاراج منو نے اور کس نے؟''

پھول متی ایک لحہ خاموش رہ کر بولی: ''تو میں اس گھر میں تمھارے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہوں۔''

اُما: ''تم جیسا سمجھو۔''

پھول متی: ''گھر میں نے بنوایا ہے۔ روپے میں نے جوڑے، باغ میں نے خریدا، اور آج اسی گھر میں میں غیر ہوں؟ منو نے یہی قانون بنایا ہے؟ اچھی بات ہے اپنا گھر بار لو۔ میری جان چھوڑو۔ اس طرح محتاج بن کر رہنا مجھے منظور نہیں۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ مر جاؤں۔ واہ رے اندھیر! میں نے ہی درخت لگایا اور میں ہی اس کا پتا نہیں توڑ سکتی۔ میں نے گھر بنوایا۔ میں ہی اس میں نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی قانون ہے تو اس میں آگ لگ جائے۔ اگر میں جانتی کہ میری یہ درگت ہونے والی ہے تو ساری جائیداد اپنے نام کرا لیتی۔''

چاروں نوجوان پر ماں کی اس تندی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قانون کا فولادی زرہ ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کچے لوہے کا ان پر کیا اثر ہوتا۔

شام ہو گئی تھی۔ دروازے پر نیم کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے پتوں میں بھی حِس نہ تھی۔ رخصت ہونے والے آفتاب کی ٹھنڈی کرنیں جیسے جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ پھول متی آہستہ سے اٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

(۴)

پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ شوہر کے مرتے ہی اپنے پیٹ کے جنے لڑکے اس کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس کا اسے کبھی خواب میں بھی گمان نہ ہوا تھا۔ جن لڑکوں کو اس نے خونِ جگر پلا پلا کر پالا، جن پر اسے اتنا غرور تھا وہی آج اسے یوں آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ واہ رے زمانے کی خوبی! اب اس گھر میں رہنا اسے عذاب معلوم ہوتا تھا۔ جہاں اس کی کچھ قدر نہیں، کچھ گنتی نہیں، وہاں لاوارثوں کی طرح پڑی روٹیاں کھائے۔ یہ اس کی خوددار طبیعت کے لیے حد درجہ گراں تھا مگر چارہ ہی کیا تھا۔ وہ لڑکوں سے الگ ہو کر رہے بھی تو کس کی ناک کٹے گی۔ زمانہ اسے تھوکے تو کیا اور لڑکوں کو تھوکے تو کیا۔ بدنامی تو اس کی ہے۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ چار جوان بیٹوں کے ہوتے بڑھیا الگ پڑی ہوئی مزدوری کر کے پیٹ پال رہی ہے۔ جسے اس نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا وہی اب اس پر ہنسیں گے۔ نہیں یہ ذلت اس

بے کسی کی ذلت سے کہیں زیادہ دل شکن تھی۔ اب اسے اپنے آپ کو ایک نئے طرز عمل کا عادی بنانا پڑے گا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اسے اب نئے ماحول کے اندر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اب تک مالکن رہی، اب لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔ ایشور کی یہی مرضی ہے۔ اپنے بیٹوں کی لاتیں اور باتیں، غیروں کی لاتوں اور باتوں کے مقابلے میں پھر بھی غنیمت ہیں۔ وہ بڑی دیر تک منہ ڈھانپے اپنی اس بے کسی پر روتی رہی۔ ساری رات اسی روحانی کوفت میں گزر گئی۔

جاڑوں کی صبح آہستہ آہستہ ڈرتی ڈرتی تاریکی کے پردے سے نکلی جیسے کوئی قیدی چھپ کر جیل سے نکل آیا ہو۔ پھول متی آج معمول کے خلاف تڑکے ہی اٹھی۔ رات بھر اس کا روحانی تناسخ ہو چکا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا اور وہ آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ رات بھر شبنم میں بھیگی ہوئی پختہ زمین اس کے ننگے پیروں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ پنڈت زندہ تھے تب اسے بہت سویرے نہ اٹھنے دیتے تھے۔ ٹھنڈا سے بہت مضر تھی مگر اب وہ دن نہیں رہے۔ جھاڑو سے فرصت پا کر اس نے آگ جلائی اور کنکریاں چننے لگی۔ رفتہ رفتہ لڑکے جاگے، بہوئیں اٹھیں۔ سبھوں نے بڑھیا کو سردی سے سکڑے ہوئے کام کرتے دیکھا پر کسی نے یہ نہ کہا کہ اماں کیوں ہلکان ہوتی ہو۔ شاید وہ بڑھیا کی اس بے کسی پر دل میں خوش ہو رہے تھے۔

آج سے پھول متی کا یہی وطیرہ ہو گیا کہ جو کچھ بن پڑے گھر کا کام کرنا، سارے گھر کی خدمت کرنا اور انتظامی امور سے الگ رہنا۔ اس کے چہرے پر جو ایک خودداری کی جھلک نمایاں تھی اس کی جگہ ایک حسرت ناک بے بسی چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جہاں بجلی جلتی تھی وہاں اب تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ جس کے بجھانے کے لیے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا کافی تھا۔ بھائیوں نے طے شدہ تجویز کے مطابق مراری لال کو انکاری خط لکھ بھیجا۔ دین دیال سے کمد کی شادی ہو گئی۔ دین دیال کی عمر چالیس سے کچھ زیادہ تھی اور خاندانی وجاہت میں ہیٹے تھے لیکن روٹی دال سے خوش تھے۔ بغیر کسی قرار کے شادی منظور کر لی۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ بارات آئی۔ شادی ہوئی۔ کمد رخصت ہو گئی۔ پھول متی کے دل پر کیا گزر رہی تھی اسے کون جان سکتا ہے۔ کمد کے دل پر کیا گزر رہی تھی اسے بھی کون جا سکتا ہے۔ لیکن چاروں بھائی بے حد خوش تھے۔ گویا ان کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو۔ شریف خاندان کی لڑکی گھر والوں کی رضا میں راضی تھی۔ تقدیر میں آرام لکھا ہوگا آرام کرے گی، تکلیف لکھی ہوگی تکلیف اٹھائے گی۔ گھر والوں نے جس سے شادی کر دی اس میں ہزار عیب ہوں تو یہی اس کا معبود، اس کا مالک۔ انحراف اس کے وہم و گمان سے باہر تھا۔

پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا۔ کمد کو کیا دیا گیا، مہمانوں کی کیا خاطر مدارات کی گئی، کس کے ہاں سے نوید میں کیا آیا، اسے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ اس سے کچھ صلاح بھی لی گئی تو

یہی کہا کہ: ''بیٹا تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اچھا ہی کرتے ہو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔''

جب کمد کے لیے دروازے پر ڈولی آ گئی اور کمد ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی تو وہ اسے اپنی کوٹھری میں لے گئی اور جو کچھ پچاس روپے اور دو چار زیور اس کے پاس بچ رہے تھے بیٹی کے آنچل میں ڈال کر بولی: ''بیٹی! میری تو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ نہیں تو آج کیا تمھاری شادی اس طرح ہوتی؟ اور تم اس طرح بدا کی جاتیں؟''

کمد نے روپے اور زیور آنچل سے نکال کر ماں کے قدموں پر رکھ دیے اور بولی: ''اماں میرے لیے تمھاری آشیر باد لاکھوں روپوں کے برابر ہے۔ تم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھو۔ نہیں معلوم ابھی تمھیں کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔'' پھول متی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُماناتھ نے آ کر کہا: ''کیا کر رہی ہو؟ کمد چل جلدی کر۔ ساعت ٹلی جاتی ہے۔ وہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں۔ پھر تو دو چار مہینے میں آئے گی ہی، جو کچھ لینا دینا ہو لے لینا۔'' پھول متی نے دل کو سنبھال کر کہا: ''میرے پاس اب کیا ہے بیٹا جو میں اسے دوں گی۔ جاؤ بیٹی، بھگوان تمھارا سہاگ امر کریں۔''

کمد رخصت ہو گئی۔ پھول متی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

(۵)

ایک سال گزر گیا۔ پھول متی کا کمرہ گھر میں سب کمروں سے وسیع اور ہوادار تھا۔ اس نے اسے بڑی بہو کے لیے خالی کر دیا اور ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہنے لگی جیسے کوئی بھکارن ہو۔ لڑکوں اور بہوؤں سے اسے اب کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اب گھر کی لونڈی تھی۔ گھر کے کسی فرد سے، کسی معاملے سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ زندہ صرف اس لیے تھی کہ اسے موت نہ آتی تھی۔ خوشی اور رنج کا اس کے اوپر کوئی اثر نہ تھا۔ اُماناتھ کا مطب کھلا، احباب کی دعوت ہوئی۔ دیاناتھ نے اخبار جاری کیا، پھر جلسہ ہوا۔ سیتاناتھ کو وظیفہ ملا۔ وہ ولایت پڑھنے گیا، پھر جشن ہوا۔ کامتاناتھ کے بڑے لڑکے کا یگیوت ہوا، خوب دھوم دھام ہوئی۔ پھول متی کے چہرے پر مسرت کی خفیف سی جھلک بھی نظر نہ آئی۔ اُماناتھ ٹائیفائڈ میں مہینہ بھر بیمار رہے۔ دیاناتھ نے ایک مضمون لکھا اور دفعہ ۱۴۴ میں چھ مہینے کے لیے جیل چلے گئے۔ اُماناتھ نے ایک معاملے میں رشوت لے کر غلط رپورٹ لکھی اور سال بھر کے لیے معطل کر دیے گئے۔ پر پھول متی کے چہرے پر رنج کی پرچھائیاں تک نہ پڑی۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی، کوئی آرزو، کوئی فکر نہ تھی۔ بس چوپایوں کی طرح کام کرنا اور کھانا، یہی اس کی زندگی کے دو کام تھے۔ جانور مارنے سے کام کرتا ہے، مگر کھاتا ہے دل سے۔ وہ بے کہے کام کرتی تھی مگر کھاتی تھی زہر کے نوالوں کی طرح۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا۔ مہینوں کپڑے نہ دھلتے۔

کچھ پروانہیں۔اس میں احساس ہی گویا فنا ہو گیا تھا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ملیریا پھیل رہا تھا۔آسمان پر مٹیالے بادل، زمین پر مٹیالا پانی۔ نم ہوا سینوں میں بلغم اور کف بھرتی پھرتی تھی۔مہری اور کہارن دونوں بیمار پڑ گئے۔ پھول متی نے گھر کے سارے برتن مانجھے۔ پانی میں بھیگ بھیگ کر سارا کام کیا۔آگ جلائی، پتیلیاں چڑھا دیں اور گنگا سے پانی لانے چلی۔کامتاناتھ روزانہ گنگا جل پیتے تھے۔نل کا پانی انھیں موافق نہ تھا۔

کامتاناتھ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کہا: ''رہنے دو اماں، میں پانی بھر لاؤں گا۔کہار اور مہری آج دونوں غائب ہیں''۔

پھول متی نے مٹیالے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: ''تم بھیگ جاؤ گے بیٹا، سردی ہو جائے گی۔''

''تم بھیگ رہی ہو، کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔''

''میں بیمار نہیں پڑوں گی۔ مجھے بھگوان نے امر کر دیا ہے۔''

اُماناتھ بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔اس کے مطب میں کچھ نفع نہ ہوتا تھا، اس لیے بہت پریشان رہتا تھا۔بولا: ''جانے بھی دو بھیا۔بہت دنوں بہوؤں پر حکومت کر چکی ہے اس کا خمیازہ اٹھانے دو۔''

گنگا بڑھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سمندر ہے۔افق پانی کے ساحل سے ملا ہوا تھا۔ کنارے کے درختوں کی صرف پھنگیاں پانی کے اوپر نظر آتی تھیں۔ پھول متی کلسا لیے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے اتری۔ پانو پھسلا، سنبھل نہ سکی، پانی میں گر پڑی۔ پل بھر ہاتھ پانو چلائے، پھر لہریں اسے نیچے کھینچ لے گئیں۔کنارے پر دو چار بندے چلائے: ''ارے بڑھیا ڈوبی جاتی ہے۔'' دو چار آدمی دوڑے بھی لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی۔ان بل کھاتی ہوئی لہروں میں، جنھیں دیکھ کر ہی انسان سہم اٹھتا تھا۔ایک نے پوچھا: ''یہ کون بڑھیا تھی؟''

''ارے وہی پنڈت اجودھیا ناتھ کی بیوہ ہے۔''

''اجودھیا ناتھ تو بہت بڑے آدمی تھے۔''

''ہاں اس کی تقدیر میں ٹھوکر کھانا لکھا تھا۔''

اس کے تو کئی لڑکے بڑے بڑے ہیں اور سب کماتے ہیں۔''

''ہاں سب ہیں بھائی، مگر تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے۔''

☆☆☆

شانتی

مرحوم دیوناتھ میرے دوستوں میں تھے۔ آج بھی جب ان کی یاد آجاتی ہے تو وہ رنگ رلیاں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔ اور کہیں تنہائی میں جا کر ذرا دیر رو لیتا ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان دو ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا۔ میں لکھنؤ میں تھا اور وہ دہلی میں۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا مہینہ جاتا کہ ہم آپس میں نہ مل لیتے ہوں۔ وہ نہایت شریف، محبت نواز اور دوستوں پر جان دینے والے آدمی تھے، جنھوں نے اپنے پرائے میں کبھی امتیاز نہیں کیا۔ دنیا کیا ہے اور یہاں شرافت و محبت کا صلہ کیا ملتا ہے، یہ انہوں نے کبھی نہ جانا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ ان کی زندگی میں کئی ایسے موقعے آئے جب انہیں آیندہ کے لیے ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا۔ دوستوں نے ان کی صاف دلی سے نامناسب فائدہ اٹھایا اور کئی مرتبہ انہیں شرمندہ بھی ہونا پڑا۔ لیکن اس بھلے آدمی نے زندگی سے سبق لینے کی قسم کھالی تھی۔ ان کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جیسے بھولا ناتھ جیے ویسے ہی بھولا ناتھ مرے۔

جس دنیا میں وہ رہتے تھے وہ نرالی دنیا تھی، جس میں بدگمانی و چالاکی اور بغض و حسد کے لیے گنجایش نہ تھی۔ سب اپنے تھے، کوئی غیر نہ تھا۔ میں نے بار بار انہیں متنبہ کرنا چاہا۔ لیکن اس کا نتیجہ امید کے خلاف برآمد ہوا۔ زندگی کے خوابوں کو پریشان کرتے ہوئے ان کا دل دکھتا تھا۔ مجھے کبھی فکر ہوتی تھی کہ انہوں نے ہاتھ بند نہ کیا تو نتیجہ کیا ہوگا؟ مصیبت یہ تھی کہ ان کی بیوی گوپا بھی کچھ اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہماری دیویوں میں جو ایک مآل اندیشی ہوتی ہے اور جو اڑاؤ مردوں کی غیر مآل اندیشیوں کے لیے بینک کا کام کرتی ہے اس سے گوپا محروم تھی۔ یہاں تک کہ اسے کپڑوں اور زیوروں کا بھی شوق نہ تھا۔

جب مجھے دیوناتھ کے انتقال کی خبر ملی اور میں بھاگا ہوا دہلی گیا تو گھر میں برتن بھانڈے کے سوا اور کوئی سامان نہ تھا۔ ابھی مرحوم کی عمر ہی کیا تھی جو زیادہ فکر کرتے۔ پورے چالیس کے بھی تو نہ ہوئے تھے۔ یوں تو لڑکپن ان کی سرشت میں داخل تھا۔ لیکن اس عمر میں سب ہی لوگ بے فکر ہوتے ہیں۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی تھی، اس کے دو لڑکے ہوئے۔ دونوں لڑکے تو بچپن ہی میں دغا دے گئے۔ لڑکی بچ رہی تھی۔

جس طرز معاشرت کے وہ عادی تھے، اسے دیکھتے ہوئے اس مختصر کنبے کے لیے دوسو روپے ماہوار کی ضرورت تھی۔ دو تین سال میں لڑکی کا بیاہ بھی کرنا ہوگا۔ کیسے کیا ہوگا۔ میری عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔

اس موقع پر مجھے یہ بیش قیمت تجربہ ہوا کہ جو لوگ خدمت خلق کرتے ہیں اور ذاتی مفاد کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں سمجھتے ان کے پس ماندوں کو آڑ دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہتی۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے، کیوں کہ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جنھوں نے زندگی میں بہتوں کے ساتھ سلوک کیے لیکن ان کے بعد ان کے بال بچوں کی کسی نے بات نہ پوچھی۔ لیکن چاہے کچھ ہو دیوناتھ کے دوستوں نے شرافت سے کام کیا اور گوپا کی بسر اوقات کے لیے روپیا جمع کرنے کی تجویز کی۔ ایک صاحب جو رنڈوے تھے اس سے بیاہ کرنے کو بھی تیار تھے لیکن گوپا نے بھی اس جذبے کا اظہار کیا جو ہماری دیویوں کا جوہر ہے اور تجویز کو مسترد کر دیا۔ مکان بہت بڑا تھا۔ اُسی کا ایک حصہ کرایے پر اٹھا دیا۔ اس طرح اس کو پچاس روپے ماہوار ملنے لگے۔ وہ اتنے ہی میں اپنا نباہ کر لے گی، جو کچھ خرچ تھا وہ سنّی کی ذات سے تھا۔

اس کے ایک ہی مہینے بعد مجھے کاروبار کے سلسلے میں غیر ملک جانا پڑا اور وہاں میرے اندازے سے کہیں زیادہ دو سال لگ گئے۔ گوپا کے خطوط برابر آتے رہتے تھے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرام سے ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گوپا نے مجھے غیر سمجھا اور صحیح حالت چھپاتی رہی۔

پردیس سے لوٹ کر میں سیدھا دہلی پہنچا۔ دروازے پر پہنچتے ہی مجھے رونا آ گیا۔ موت کی افسردگی سی طاری تھی۔ جس کمرے میں دوستوں کے جمگھٹ رہتے تھے، اس کے دروازے بند تھے۔ مکڑیوں نے چاروں طرف جالے تان رکھے تھے۔ پہلی نظر میں تو شبہ ہوا کہ دیوناتھ دروازے پر کھڑے میری طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں تو ہم پرست نہیں ہوں اور اجسام روحانی کا بھی قائل نہیں، لیکن اس وقت میں ایک بار چونک ضرور پڑا۔ دل میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی، لیکن دوسری نظر میں یہ خیالی تصویر مٹ چکی تھی۔ دروازہ کھلا۔ گوپا کے سوا کھولنے والا ہی کون تھا؟

میں نے اسے دیکھ کر دل تھام لیا۔ اسے میرے آنے کی اطلاع تھی اور اس نے میرے استقبال کے لیے نئی ساری پہن لی تھی اور شاید بال بھی گوندھ لیے تھے۔ پر ان دو برسوں میں وقت نے اس پر جو مظالم کیے تھے انہیں وہ کیا کرتی؟ عورتوں کی زندگی میں یہ وہ عمر ہے جب حسن و شباب اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ جب اس میں الھڑ پن، شرم اور بے اعتنائی کی جگہ لگاوٹ، خوش ادائی اور دل آویزی کی جاتی ہے۔ لیکن گوپا کی جوانی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر جھرّیاں تھیں، بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔

میں نے پوچھا س: ''کیا تم بیمار تھیں گوپا؟''

اس نے آنسو پی کر کہا: ''نہیں تو، میرے تو کبھی سر میں درد بھی نہیں ہوا۔''

''تو تمھاری یہ کیا حالت ہے؟ بالکل بوڑھی ہو گئیں۔''

''تو اب جوانی لے کر کرنا ہی کیا ہے؟ میری عمر بھی تو بتیس سے اوپر ہو گئی۔''

''یہ عمر تو زیادہ نہیں ہوتی۔''

''ہاں ان کے لیے جو بہت دن جینا چاہتے ہوں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس سنّی کے بیاہ کی فکر ہے۔ اس سے چھٹی پا جاؤں، پھر مجھے زندگی کی پروا نہ رہے گی۔''

اب معلوم ہوا کہ جو صاحب اس مکان میں کرایہ دار تھے وہ تھوڑے دنوں بعد تبدیل ہو کر چلے گئے اور تب سے کوئی دوسرا کرایہ دار نہ آیا۔ میرے دل میں برچھی سی چبھ گئی۔ اتنے دنوں ان بے چاروں نے کس طرح بسر کی۔ یہ خیال ہی دردناک تھا۔

میں نے متاسف ہو کر کہا: ''لیکن تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ کیا میں بالکل غیر ہوں؟''

گوپا نے شرمندہ ہو کر کہا: ''نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ تمھیں غیر سمجھوں گی تو اپنا کسے سمجھوں گی؟ میں نے سوچا پردیس میں تم خود اپنے جھمیلے میں پڑے ہو گے تمھیں کیا سناؤں؟ کسی نہ کسی طرح دن کٹ ہی گئے۔ گھر میں اور کچھ نہ تھا تو تھوڑے سے گہنے تھے ہی۔ اب سنیتا کے بیاہ کی فکر ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس مکان کو الگ کر دوں گی۔ بیس بائیس ہزار روپے مل جائیں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مکان پہلے ہی رہن ہو چکا ہے اور سود ملا کر اس پر بیس ہزار ہو گئے ہیں۔ مہاجن نے اتنی ہی دَیا کیا کم کی کہ مجھے گھر سے نکال نہیں دیا۔ ادھر سے تو اب کوئی امید نہیں۔ بہت ہاتھ پانو جوڑنے پر شاید مہاجن سے دو ڈھائی ہزار روپے اور مل جائیں۔ اتنے میں کیا ہو گا۔ اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔ لیکن میں بھی کتنی مطلبی ہوں۔ نہ تمھیں ہاتھ منہ دھونے کو پانی دیا، نہ کچھ ناشتہ کو لائی اور اپنا دُکھڑا لے بیٹھی۔ اب آپ کپڑے اتاریے اور آرام سے بیٹھیے۔ کچھ کھانے کو لاؤں کھا لیجیے، تب باتیں ہوں۔ گھر میں تو سب خیریت ہے؟''

میں نے کہا: ''میں بمبئی سے سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔ گھر کہاں گیا؟''

گوپا نے مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ اس وقت اس کی نگاہوں میں شباب کی جھلک تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے چہرے کی جھرّیاں مٹ گئی ہیں۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی ہے۔ اس نے کہا: ''اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمھاری دیوی جی تمھیں کبھی یہاں نہ آنے دیں گی۔''

''میں کسی کا غلام ہوں؟''

''کسی کو اپنا غلام بنانے کے لیے پہلے خود بھی اس کا غلام بننا پڑتا ہے۔''

شام ہو رہی تھی۔ سنیتا لالٹین لے کر کمرے میں آئی۔ دو سال پیشتر کی معصوم لڑکی اب منزلِ شباب میں قدم رکھ چکی تھی۔ جسے میں گود میں اٹھا کر پیار کیا کرتا تھا، اس کی طرف آج آنکھیں نہ اٹھا سکا اور وہ جو میرے گلے سے لپٹ کر خوش ہوتی تھی آج میرے سامنے کھڑی بھی نہ رہ سکی۔ جیسے مجھ سے کوئی چیز چھپانا چاہتی ہے اور جیسے میں اسے اس چیز کے چھپانے کا موقع دے رہا ہوں۔

میں نے پوچھا: ''سنی، اب تم کس درجے میں پڑھتی ہو؟''

اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا: ''دسویں میں ہوں۔''

''گھر کا بھی کچھ کام کاج کرتی ہو؟''

''اماں جب کرنے بھی دیں۔''

گوپا نے کہا: ''میں نہیں کرنے دیتی یا خود کسی کام کے قریب نہیں جاتی۔''

سنیتا منہ پھیر کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔ ماں کی دلاری لڑکی تھی۔ جس دن گرہستی کا کام کرتی اس دن شاید گوپا رو رو کر آنکھیں پھوڑ لیتی۔ وہ خود لڑکی کو کام نہ کرنے دیتی تھی۔ مگر سب سے شکایت کرتی تھی کہ وہ کام نہیں کرتی۔ یہ شکایت بھی اس کے پیار کا ہی ایک کرشمہ تھا۔

میں کھانا کھا کر لیٹا تو گوپا نے پھر سنیتا کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کے سوا اس کے پاس اور بات ہی کیا تھی۔ لڑکے تو بہت ملتے ہیں لیکن کچھ حیثیت بھی تو ہو۔ لڑکی کو یہ سوچنے کا موقع کیوں ملے کہ دادا ہوتے تو میرے لیے شاید اس سے اچھا بَر ڈھونڈتے۔ پھر گوپا نے ڈرتے ڈرتے لالہ مداری لال کے لڑکے کا ذکر کیا۔

میں نے متحیر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ لالہ مداری لال پہلے انجینئر تھے۔ اب پنشن پاتے تھے۔ لاکھوں روپے جمع کر لیے تھے۔ پر اب تک ان کی حرص کی پیاس نہ بجھی تھی۔ گوپا نے گھر بھی وہ چھانٹا تھا جہاں اس کی رسائی دشوار تھی۔

گوپا نے کہا: ''مداری لال تو بہت ہی بڑا آدمی ہے۔''

گوپا نے دانت تلے زبان دبا کر کہا: ''ارے نہیں بھیا تم نے انھیں پہچانا نہ ہوگا۔ میرے اوپر بڑے دیالو ہیں۔ کبھی کبھی آ کر خیریت بھی پوچھ جاتے ہیں۔ لڑکا ایسا ہونہار کہ میں تم سے کیا کہوں۔ پھر ان کے ہاں کمی کس بات کی ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے وہ خوب رشوت لیتے تھے۔ لیکن یہاں دھرماتما کون ہے؟ کون موقع پا کر چھوڑ دیتا ہے۔ مداری لال نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ مجھ سے جہیز نہیں چاہتے۔ صرف لڑکی چاہتے ہیں۔ سنی ان کے من میں بیٹھ گئی ہے۔''

مجھے گوپا کی سادگی پر رحم آیا۔ لیکن میں نے سوچا کہ میں اس کے دل میں کسی کے خلاف

شبہات کیوں پیدا کروں۔ شاید مداری لال اب وہ نہ رہے ہوں۔ انسان کی طبیعت بدلتی رہتی ہے۔

میں نے متفق ہو کر کہا: ''مگر یہ تو سوچو کہ تم میں اور ان میں کس قدر فرق ہے۔ تم شاید اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ان کا منہ سیدھا نہ کر سکو۔''

لیکن گوپا کے من میں یہ بات جم گئی تھی کہ وہ سنی کو ایسے گھر میں بیاہنا چاہتی تھی جہاں وہ رانی بن کر رہے۔

دوسرے دن میں مداری لال کے پاس گیا اور ان سے جو میری بات چیت ہوئی اس نے مجھے مطمئن کر دیا۔ کسی زمانے میں وہ لالچی رہے ہوں گے لیکن اس وقت تو انھیں بہت ہی بلند اور پاک دل پایا۔

بولے: ''بھائی صاحب! میں دیوناتھ جی سے خوب واقف ہوں۔ وہ آدمیوں میں رتن تھے۔ ان کی لڑکی میرے گھر میں آئے، یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ اس کی ماں سے کہہ دیجیے مداری لال ان سے کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا۔ خدا کا دیا ہوا میرے گھر میں سب کچھ ہے۔ میں انھیں زیر بار کرنا نہیں چاہتا۔''

میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔ ہم سُنی سنائی باتوں سے دوسروں کے متعلق کیسے غلط خیالات قائم کر لیتے ہیں۔ میں نے آ کر گوپا کو مبارک باد دی۔ یہ طے ہوا کہ گرمیوں میں بیاہ کر دیا جائے گا۔

.....

چار مہینے گوپا نے بیاہ کی تیاریوں میں کاٹے۔ میں مہینے میں ایک مرتبہ ضرور اس سے مل جاتا تھا، لیکن ہر مرتبہ مایوس ہو کر لوٹتا۔ گوپا نے اپنے خاندان کی عزت کا نہ جانے کتنا بڑا نصب العین اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ دیوانی اس بھرم میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کی یہ اولوالعزمی شہر میں اپنی یادگار چھوڑ جائے گی۔ یہ نہ جانتی تھی کہ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں اور آئے دن بھلا دیے جاتے ہیں۔ شاید وہ دنیا سے یہ کہلوانا چاہتی تھی کہ اس گئی گزری حالت میں بھی لٹا ہوا ہاتھی نو لاکھ کا ہے۔ قدم قدم پر اسے دیوناتھ کی یاد آتی۔ وہ ہوتے تو یہ کام یوں نہ ہوتا یوں ہوتا اور تب وہ روتی۔ مداری لال نیک آدمی ہے۔ سچ ہے لیکن گوپا کا اپنی بیٹی کے متعلق بھی تو کچھ فرض ہے۔ اس کے دس پانچ لڑکیاں تھوڑی ہی ہیں۔ وہ تو دل کھول کر ارمان نکالے گی۔ سنیتا کے لیے اس نے جتنے گہنے اور جوڑے بنوائے تھے انھیں دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ کبھی ستاروں کی دکان پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کبھی مہمانوں کی مدارات کا انتظام کر رہی ہے۔ محلے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس سے اس نے قرض نہ لیا ہو۔ وہ اسے قرض سمجھتی تھی پر دینے والے دان سمجھ کر دیتے تھے۔ سارا محلہ اس کا مددگار تھا۔ سنیتا اب محلے کی لڑکی تھی۔ گوپا کی عزت سب کی عزت ہے۔ اور گوپا کے لیے تو نیند اور آرام حرام تھا۔

درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ آدھی رات ہوگئی ہے مگر وہ بیٹھی کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔

اکیلی عورت اور وہ بھی نیم جان، کیا کیا کرے؟ جو کام دوسروں پر چھوڑ دیتی ہے اسی میں کچھ نہ کچھ خرابی ہو جاتی ہے لیکن اس کی ہمت ہے کہ کسی طرح نہیں مانتی۔

پچھلی مرتبہ اس کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ بولا: ''گوپا دیوی، اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو شادی ہو جانے کے بعد مرنا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس کے پہلے ہی کہیں چل نہ دو۔''

گوپا نے جواب دیا: ''بھیا! اس کی فکر نہ کرو۔ بیوہ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ تم نے سنا نہیں رانڈ مرے نہ کھنڈر ڈھہے۔ لیکن میری تمنا یہی ہے کہ سنی کوٹھکانے لگا کر میں بھی چل دوں۔ اب زندہ رہ کر کیا کروں گی۔ سوچو، کیا کروں۔ اگر کسی طرح کا رخنہ پڑ گیا تو کس کی بدنامی ہوگی؟ ان چار مہینوں میں مشکل سے گھنٹہ بھر سوتی ہوں گی۔ نیند ہی نہیں آتی۔ لیکن میرا دل خوش ہے۔ میں مروں یا جیوں مجھے تسکین تو ہوگی کہ سنیتا کے لیے اس کا باپ جو کر سکتا تھا وہ میں نے کر دیا۔ مداری لال نے اپنی شرافت دکھائی تو مجھے بھی اپنی ناک رکھنی ہے۔''

ایک دیوی نے آ کر کہا: ''بہن! ذرا چل کر دیکھ لو۔ چاشنی ٹھیک ہوگئی ہے یا نہیں؟'' گوپا اس کے ساتھ چاشنی کا امتحان کرنے گئی اور ایک لمحہ بعد آ کر بولی: ''جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لوں۔ تم سے ذرا باتیں کرنے لگی، ادھر چاشنی اتنی کڑی ہوگئی کہ لڈو دانتوں سے لڑیں گے۔ کسی سے کیا کہوں؟''

میں نے چڑ کر کہا: ''تم بیکار کی جھنجھٹ کر رہی ہو۔ کیوں نہیں کسی حلوائی کو بلا کر مٹھائیوں کا ٹھیکہ دے دیتیں؟ پھر تمھارے یہاں مہمان ہی کتنے آئیں گے جن کے لیے یہ طومار باندھ رہی ہو۔ دس پانچ کی مٹھائی ان کے لیے بہت ہوگی۔''

میری یہ بات شاید گوپا کو ناگوار ہوئی۔ ان دنوں اسے بات بات پر غصہ آ جاتا تھا۔

بولی: ''بھیا! تم یہ باتیں نہ سمجھو گے۔ تمھیں نہ ماں بننے کا موقع ملا نہ بیوی بننے کا۔ سنیتا کے باپ کا کتنا نام تھا۔ کتنے آدمی ان کے دم سے پلتے تھے۔ کیا تم نہیں جانتے یہ پگڑی میرے ہی سر تو بندھی ہے۔ تمھیں یقین نہ آئے گا، ناستک ہی جو ٹھہرے! پر میں تو انھیں سدا اپنے اندر بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔ جو کچھ کر رہے ہیں وہی کر رہے ہیں۔ میں ناقص العقل بھلا اکیلی کیا کر لیتی؟ وہی میرے مددگار ہیں، وہی میرے رہبر ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ جسم میرا ہے لیکن اس کے اندر جو آتما ہے وہ ان کی ہے۔ تم ان کے دوست ہو۔ تم نے اپنے سیکڑوں روپے خرچ کیے اور اتنے حیران ہو رہے ہو۔ میں تو ان کی شریک زندگی ہوں۔ لوک میں بھی اور پرلوک میں بھی۔''

میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

جون میں شادی ہوگئی۔ گوپا نے بہت کچھ دیا اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ دیا لیکن پھر

بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔ اگر آج سنیتا کے باپ ہوتے تو نہ جانے کیا کرتے! برابر روتی رہی۔

جاڑوں میں میں پھر دہلی گیا کہ گوپا اب خوش ہوگی۔ لڑکی کا گھر اور بر دونوں اچھے ہیں۔ گوپا کو اس کے سوا اور کیا چاہیے۔ لیکن سکھ اس کے مقدر میں ہی نہ تھا۔

میں ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ اس نے اپنا دکھڑا شروع کر دیا: ''بھیا! گھر دوار سب کچھ اچھا ہے، ساس سسر بھی اچھے ہیں لیکن داماد نکما نکلا۔ سنّی بے چاری رو رو کر دن کاٹ رہی ہے۔ تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو۔ بس اس کا سایہ ہی رہ گیا ہے۔ ابھی چند دن ہوئے آئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر چھاتی پھٹتی ہے۔ نہ تن بدن کی سدھ ہے، نہ کپڑے لتے کی۔ میری سنیتا کی یہ درگت ہوگی، یہ تو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ بالکل گم سم سی ہوگئی ہے۔ کتنا پوچھا، بیٹا تجھ سے وہ کیوں نہیں بولتا۔ بس آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔ میری سنّی تو کنویں میں گر گئی۔''

میں نے کہا: ''تم نے اس کے گھر والوں سے پتا نہیں لگایا؟''

''لگایا کیوں نہیں بھیا۔ سب حال معلوم ہوگیا۔ لڑکا چاہتا ہے کہ میں چاہے جس راہ جاؤں سنّی میری پوجا کرتی رہے۔ سنّی بھلا اسے کیوں سہنے لگی۔ اسے تم جانتے ہو کہ کتنی خوددار ہے۔ وہ ان عورتوں میں نہیں ہے جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اس کی بدسلوکیاں برداشت کرتی رہتی ہیں۔ اس نے ہمیشہ دلار پایا ہے۔ باپ بھی اس پر جان دیتا تھا۔ میں بھی آنکھ کی پتلی سمجھتی تھی۔ شوہر ملا چھیلا جو آدھی آدھی رات تک مارا مارا پھرتا ہے۔ دونوں میں کیا بات ہوئی یہ کون جان سکتا ہے لیکن دونوں میں کوئی گانٹھ پڑ گئی ہے۔ نہ وہ سنّی کی پروا کرتا ہے اور نہ سنّی اس کی پروا کرتی ہے۔ مگر وہ تو اپنے رنگ میں مست ہے۔ سنّی جان دیے دیتی ہے۔''

میں نے کہا: ''لیکن تم نے سنیکو سمجھایا نہیں۔ اس لونڈے کا کیا بگڑے گا۔ اس کی زندگی خراب ہو جائے گی۔''

تو گوپا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بولی: ''بھیا! کس دل سے سمجھاؤں؟ سنّی کو دیکھ کر تو میری چھاتی پھٹتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں کہ اسے کوئی کڑی آنکھ سے دیکھ بھی نہ سکے۔ سنّی پھوہڑ ہوتی، آرام طلب ہوتی تو سمجھاتی بھی۔ کیا یہ سمجھاؤں کہ تیرا شوہر گلی گلی منہ کالا کرتا پھرے اور تو اس کی پوجا کر۔ میں تو خود یہ ذلت برداشت نہ کر سکتی۔ مرد اور عورت میں بیاہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں سولہ آنے ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ ایسے مرد کم ہیں جو عورت کی کج نگاہی بھی برداشت کر سکیں۔ لیکن ایسی عورتیں بہت ہیں جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں۔ سنّی ان عورتوں میں نہیں ہے۔ وہ اگر محبت کرتی ہے تو محبت چاہتی بھی ہے۔ اور اگر شوہر میں یہ بات نہ ہوگی تو اس سے واسطہ نہیں رکھے گی۔ چاہے اس کی ساری زندگی روتے کٹ جائے۔''

یہ کہہ کر گوپا اندر گئی اور ایک سنگھار دان لا کر بولی۔ سنّی اسے اب کے یہیں چھوڑ گئی۔ اسی لیے آئی تھی۔ یہ وہ گہنے ہیں جنھیں میں نے نہ جانے کتنی تکلیفیں برداشت کر کے بنوائے تھے۔ ان کے پیچھے مہینوں ماری ماری پھری تھی۔ یوں کہو کہ بھیک مانگ کر جمع کیے تھے۔ سنّی اب ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ پہنے تو کس لیے؟ سنگھار کرے تو کس پر؟ پانچ صندوق کپڑوں کے دیے تھے۔ کپڑے سیتے سیتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ وہ سب کپڑے اٹھا لائی۔ ان چیزوں سے اسے اب نفرت سی ہوگئی ہے۔ بس کلائی میں کانچ کی دو چوڑیاں اور ایک اجلی سی ساری یہی اس کا سنگھار ہے۔''

میں نے گوپا کو دلاسا دیا کہ میں جا کر ذرا کیدار ناتھ سے ملوں گا۔ دیکھوں تو وہ کس رنگ ڈھنگ کا آدمی ہے۔

گوپا نے ہاتھ جوڑ کر کہا: ''بھیا! بھول کر بھی نہ جانا۔ سنّی سنتے ہی جان دے دے گی۔ غیرت کی پتلی ہی سمجھو اسے۔ رسّی سمجھ لو جس کے جل جانے پر بھی بل نہیں جاتے۔ جن پیروں نے اسے ٹھکرا دیا ہے انھیں وہ کبھی نہ سہلائے گی۔ اسے اپنا بنا کر کوئی چاہے تو لونڈی بنا لے لیکن حکومت تو اس نے میری نہ سہی، دوسروں کی کیا سہے گی۔''

میں نے گوپا سے تو اس وقت کچھ نہ کہا۔ لیکن موقع پاتے ہی لالہ مداری لال سے ملا۔ میں راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے باپ بیٹے دونوں ایک ہی جگہ مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی کیدار ناتھ نے اس طرح جھک کر چرن چھوئے کہ میں اس کی سعادت مندی سے متاثر ہوا۔ جلدی سے اندر گیا اور چائے، مربہ اور مٹھائیاں لایا۔ اتنا شایستہ، اتنا شریف اور اتنا خلیق نوجوان میں نے نہ دیکھا تھا۔ یہ گمان ہی نہ ہوسکتا تھا کہ اس کے اندر اور باہر میں کوئی فرق ہوسکتا ہے۔ جب تک رہا سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب وہ ٹینس کھیلنے چلا گیا تو میں نے مداری لال سے کہا:

''کیدار بابو تو بہت ہی نیک معلوم ہوتے ہیں۔ پھر میاں بیوی میں اتنی کشیدگی کیوں ہوگئی ہے؟''

مداری لال نے ایک لمحہ غور کر کے جواب دیا: ''اس کا سبب سوائے اس کے اور کیا بتاؤں کہ اپنے ماں باپ کے لاڈلے ہیں اور پیار لڑکوں کو اپنے من کا بنا دیتا ہے۔ میری ساری عمر محنت میں کٹی، اب جا کر ذرا راحت ملی ہے۔ رنگ رلیوں کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ دن بھر محنت کرتا تھا اور شام کو پڑ کر سو رہتا تھا۔ صحت بھی اچھی نہ تھی۔ اس لیے برابر یہی فکر سوار رہتی تھی کہ کچھ جمع بھی کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے بال بچے بھیک مانگتے پھریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مہاشے کو مفت کی دولت ملی۔ سنک سوار ہوگئی، شراب اڑنے لگی، پھر ڈراما کھیلنے کا شوق ہوا۔ روپے کی کمی تھی نہیں، اس پر ماں باپ کے اکیلے بیٹے، ان کی خوشی ہی ہماری زندگی کی بہشت تھی۔ پڑھنا لکھنا تو دور رہا آوارگی کی طرف رجحان بڑھتا

گیا۔ رنگ اور گہرا ہوا اور اپنی زندگی کا ڈراما کھیلنے لگے۔ میں نے یہ رنگ دیکھا تو مجھے فکر ہوئی۔ سوچا بیاہ کر دوں، ٹھیک ہو جائے گا۔ گوپا دیوی کا پیغام آیا تو میں نے منظور کر لیا۔ میں سنّی کو دیکھ چکا تھا۔ سوچا ایسی خوب صورت بیوی پا کر اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن اتفاق سے وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی۔ ضدی اور ہٹیلی۔ مفاہمت کا زندگی میں کیا درجہ ہے اس کی اسے خبر ہی نہیں۔ لوہا لوہے سے لڑ گیا۔ یہ ہے سارا بھید اور صاحب میں تو بہو ہی کو زیادہ خطاوار سمجھتا ہوں۔ لڑکے تو سب ہی من چلے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی ذمے داری سمجھتی ہیں۔ ان کی سیوا، قربانی اور محبت یہی ان کے وہ ہتھیار ہیں جن سے وہ اپنے شوہر پر فتح حاصل کر لیتی ہیں۔ بہو میں یہ گن نہیں ہیں۔ ناؤ کیسے پار ہوگی، خدا ہی جانے۔''

اتنے میں سنیتا اندر سے آ گئی۔ اپنی تصویر کا بالکل مٹا ہوا خاکہ تھی۔ کنن تپ کر بھسم ہو گیا تھا۔ مٹی ہوئی تمناؤں کی اس سے اچھی تصویر نہیں ہو سکتی۔ مجھ پر طعن کرتی ہوئی بولی: ''آپ جانے کب سے بیٹھے ہوئے ہیں، مجھے خبر تک نہیں۔ آپ شاید باہر ہی باہر چلے بھی جاتے۔''

میں نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا: ''نہیں سنّی! یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ تمھارے پاس آ ہی رہا تھا کہ تم خود آ گئیں۔''

لالہ مداری لال کمرے سے باہر اپنے موٹر کی صفائی کرنے لگے۔ شاید مجھے سنّی سے بات چیت کا موقع دینا چاہتے تھے۔

سنّی نے پوچھا: ''اماں تو اچھی ہیں؟''

میں نے کہا: ''وہ تو اچھی ہیں۔ لیکن تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے؟''

''میں تو بہت اچھی طرح ہوں۔''

''یہ بات کیا ہے؟ تم لوگوں میں کیا اَن بَن ہے؟ گوپا دیوی جان دیے ڈالتی ہیں۔ تم خود مرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ کچھ تو عقل سے کام لو۔''

سنّی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بولی: ''آپ نے ناحق یہ گفتگو چھیڑ دی۔ میں نے تو یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کہ میں بدنصیب ہوں۔ بس ان باتوں کا علاج میرے قابو سے باہر ہے۔ میں اس زندگی سے موت کو کہیں بہتر سمجھتی ہوں۔ جہاں اپنی قدر نہ ہو زندگی کی کوئی دوسری شکل میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس معاملے میں کسی طرح کا سمجھوتہ کرنا میرے لیے غیر ممکن ہے۔ نتیجے کی میں پروا نہیں کرتی۔''

''لیکن...''

''نہیں چاچا جی۔ اس معاملے میں آپ کچھ نہ کہیے۔ نہیں تو میں چلی جاؤں گی۔''

''آخر سوچو تو...''

''میں سب سوچ چکی اور طے کر چکی۔ حیوان کو انسان بنانا میری طاقت سے باہر ہے۔''

مئی کا مہینا تھا۔ میں مسوری گیا تھا کہ گوپا کا تار پہنچا: ''فوراً آؤ بہت ضروری کام ہے۔'' میں گھبرا کر دوسرے ہی دن دہلی پہنچا۔ گوپا دِق کی مریضہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا: ''سنّی تو اچھی ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''ہاں۔''

''اور کیدار ناتھ؟''

''وہ بھی اچھی طرح ہے۔''

''تو ماجرا کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''تم نے مجھے تار دے کر بلایا اور پھر کہتی ہو کہ کوئی بات نہیں۔''

''دل گھبرا رہا تھا، اس لیے تم کو بلایا۔ سنّی کو کسی طرح سمجھا کر یہاں لانا ہے۔ میں تو سب کچھ کر کے تھک گئی۔''

''کیا اِدھر کوئی نئی بات ہوئی ہے؟''

''نئی تو نہیں۔ لیکن ایک طرح سے نئی ہی سمجھو۔ کیدار ایک ایکٹرس کے ساتھ کہیں بھاگ گیا۔ ایک ہفتے سے کچھ پتا نہیں۔ سنّی سے کہہ گیا ہے کہ جب تک تم رہو گی میں گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ سنا ہے کہ کیدار اپنے باپ کے جعلی دستخط بنا کر کئی ہزار روپے بھی بینک سے لے گیا ہے۔''

''تم سنّی سے ملی تھیں؟''

''ہاں، تین دن سے برابر جا رہی ہوں۔''

''اگر سنّی نہیں آنا چاہتی تو تم رہنے کیوں نہیں دیتیں؟''

''وہاں وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔''

میں اسی وقت مداری لال کے پاس گیا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی بولے: ''بھائی صاحب! میں تو لٹ گیا۔ لڑکا بھی گیا اور بہو بھی گئی۔''

معلوم ہوا کہ جب سے کیدار غائب ہو گیا ہے، سنّی اور بھی اداس رہنے لگی تھی۔ اس نے اسی دن اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا۔ کسی سے بات نہ کرتی تھی۔ آج صبح وہ جمنا اشنان کرنے گئی۔ اندھیرا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ کسی کو نہیں جگایا۔ جب دن چڑھ گیا اور بہو نہ ملی تو اس کی تلاش ہونے لگی۔ دوپہر کو پتا چلا کہ جمنا گئی ہے۔ لوگ ادھر بھاگے۔ وہاں اس کی لاش ملی۔ پولیس آئی۔ لاش کا معائنہ ہوا۔ اب لاش واپس ملی ہے۔''

میں کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ ارتھی کے ساتھ گیا اور وہاں سے لوٹا تو رات کے دس بج گئے

تھے۔ میرے پانو کانپ رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ خبر پاکر گوپا کی کیا حالت ہوگی۔ اس ابھاگن کے باغِ تمنا میں یہی ایک پودا تھا۔ اسے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر پال رہی تھی۔ اس کے بسنت کا سنہرا خواب ہی اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ اس میں کونپلیں نکلیں گی، پھول کھلیں گے، پھل آئیں گے، چڑیاں اس کی ڈالیوں میں بیٹھ کر اپنے سہانے راگ گائیں گی۔ لیکن آج موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس پودے کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کی زندگی اب بیکار تھی۔ وہ نقطہ ہی مٹ گیا تھا جس پر زندگی کے تمام خطوط آکر ملتے تھے۔ دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے میں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ گوپا ایک لالٹین لیے نکلی۔ میں نے گوپا کے چہرے پر سکون کی ایک نئی جھلک دیکھی۔ اس نے مجھے غمگین دیکھ کر محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: ''آج تو تمھیں سارا دن روتے ہی کٹا۔ لاش کے ساتھ تو بہت آدمی ہوں گے۔ میرے جی میں بھی آیا تھا کہ چل کر سنّی کا آخری درشن کرلوں۔ لیکن میں نے سوچا کہ جب سنّی ہی نہ رہی تو اس کی لاش میں کیا رکھا ہے۔ نہ گئی۔''

میں حیرت سے گوپا کا منہ دیکھنے لگا۔ اسے اس افسوس ناک حادثے کی اطلاع مل گئی تھی۔ لیکن وہ کس قدر صابر و پُرسکون ہے۔ میں نے کہا: ''اچھا، کیا تم نہیں گئیں۔ رونا ہی تو تھا۔''

گوپا نے کہا: ''ہاں اور کیا۔ روئی تو یہاں بھی۔ لیکن تم سے سچ کہتی ہوں کہ دل سے نہیں روئی۔ نہ جانے آنسو کس طرح نکل آئے۔ مجھے تو درحقیقت سنّی کی موت سے خوشی ہوئی۔ بدنصیب اپنی عزت و خودداری کے لیے دنیا سے رخصت ہوگئی۔ نہیں تو نہ جانے کیا کیا دیکھنا پڑتا۔ اس لیے اور بھی خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نبھادی۔ عورت کو زندگی میں محبت نہ ملے تو اس کا مرجانا ہی اچھا ہے۔ تم نے سنّی کی لاش دیکھی تھی؟ لوگ کہتے ہیں ایسا جان پڑتا تھا کہ مسکرا رہی ہے۔ میری سنّی سچ مچ دیوی تھی۔ بھیا! انسان اس لیے تھوڑے ہی جینا چاہتا ہے کہ روتا رہے۔ جب معلوم ہوگیا کہ زندگی میں دُکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو آدمی جی کر کیا کرے؟ کس لیے جیے؟ کھانے سونے اور مرجانے کے لیے؟ یہ میں نہیں کہتی کہ مجھے سنّی کی یاد نہ آئے گی یا میں اسے یاد کر کے روؤں گی نہیں، لیکن وہ غم کے آنسو نہ ہوں گے خوشی کے آنسو ہوں گے۔ بہادر بیٹے کی ماں اس کی بہادری سے خوش ہوتی ہے۔ سنّی کی موت کیا کم باعثِ فخر ہے؟ میں آنسو بہا کر اس فخر کو کیوں برباد کروں؟ وہ جانتی ہے کہ ساری دنیا اس کی مذمت کرے، اس کی ماں اس کی تعریف ہی کرے گی۔ اس کی روح سے یہ مسرت بھی چھین لوں؟ لیکن اب رات زیادہ ہوگئی ہے۔ اوپر جا کر سو رہو۔ میں نے تمھاری چارپائی بچھادی ہے۔ مگر دیکھو! اکیلے پڑے پڑے رونا نہیں۔ سنّی نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس کے پِتا ہوتے تو آج سنّی کی مورت بنا کر پوجتے۔''

☆☆☆

روشنی

(۱)

آئی۔سی ایس۔ پاس کر کے ہندستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی۔ میری دلی مراد بر آئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلے ہی پر کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی! اس لیے سیر و شکار اور اخبارات و رسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے! سوچتا تھا وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شان دار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا۔ پھاگن کا مہینہ۔ میں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانے کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی، مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی، مگر ناخوش گوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں۔ کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا، کیوں کہ ان دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا: ''چلو بیٹا چلو۔ ڈھائی گھنٹے کی دوڑ ہے۔ شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے اور ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دیے گئے تھے۔''

جا بجا کاشت کار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیار ہو چلی تھی۔ اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ ذرا ذرا سے مزرعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل، وہی افسوس ناک جہالت، وہی شرم ناک نیم برہنگی، اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائرکٹر، انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیر نہیں۔ تعلیم کا طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی

حالت میں لیئے پاتا ہوں۔ بڑی دوادوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کرلیا ہو اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں۔ مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا۔ لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل۔ آج تو مغرب دنیا کا مشعلِ ہدایت ہے۔ ننھا سا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی ہے۔ اپنی صنعت وحرفت کی بدولت بے شک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے، جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ آج بھی شجر وحجر کی عبادت ہوتی ہے، جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے۔ اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انھیں تصورات میں ڈوبا ہوا چلا جارہا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا۔ مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہورہا تھا، افق گرد وغبار کے پردے میں چھپ گیا تھا، آندھی کی علامت تھی۔ میں نے گھوڑے کو تیز کیا۔ لیکن لحہ بہ لحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جاتا تھا اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکہ وتنہا طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جارہا تھا۔ ہوا تیز ہوگئی، وہ پردۂ غبار سر پر آپہنچا اور دفعتاً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سرسراہٹ اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الامان، گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجھتا تھا، یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اُف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منہ چھپالیا۔ سنگریزے گرد کے ساتھ اڑ کر منہ پر اس طرح لگتے تھے، جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلط ہوگئی۔ کسی درخت کے اکھڑنے کی آواز کانوں میں آجاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں۔ کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔ طوفان میں ہی بڑے بڑے تودے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی ایسا تودہ لڑھکتا ہوا آجائے تو بس خاتمہ ہے، ہلنے کی بھی تو گنجایش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سوجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم داہنے بائیں ہوجاؤں تو ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آکر صفایا کردے گا۔ دل پر بے اختیار رقت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتا نہ چلے۔ افوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھس گیا۔

دفعتاً جھن جھن کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس ارراہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آرہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی۔ مگر اسے راستہ کیوں کر سوجھ رہا ہے۔ کہیں سانڈنی ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائیں۔ کوئی زمین دار ہوگا۔ مجھے دیکھ کر شاید پہنچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے۔ مگر ہے بلا کا ہمت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز قریب آ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی جا رہی ہے، نہ آندھی کا خوف ہے نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ، نہ چٹانوں کے گرنے کا غم، گویا یہ بھی کوئی روزمرہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پوچھا اور اس سے بولا: ''او عورت! گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں، مگر آواز دس گز نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا: ''او عورت! ذرا ٹھہر جا۔ گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت رک گئی۔ اس نے میرے قریب آ کر، مجھے دیکھ کر، ذرا سر جھکا کر کہا: ''کہاں جاؤ گے؟''

''گجن پور کتنی دور ہے؟''

''چلے آؤ۔ آگے ہمارا گانو ہے۔ اس کے بعد گجن پور ہے۔''

''تمھارا گانو کتنی دور ہے؟''

''وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے۔''

''تم اس آندھی میں کہیں رک کیوں نہیں گئیں؟''

''چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں۔ کیسے رک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا۔''

آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا۔ گرد و غبار کی ایک دھونکنی سی منہ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلسفے نے کہا اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے۔ بیکسی میں موت کا کیا غم۔ موت تو اسے باعثِ نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دلفریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے۔ حوصلے ہیں، ارادے ہیں۔ میں

اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منہ چھپالیا۔ شتر مرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالو میں سر چھپالیتا ہے۔

(۲)

وہ آندھی کی آخری سانس تھی۔ اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہوگیا۔ نہ گرد و غبار کا نشان تھا، نہ ہوا کے جھونکوں کا۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آگئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے۔ سامنے ایک پہاڑی تھی۔ اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تھا۔ میں جوں ہی اس گانو میں پہنچا، وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے مری طرف آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا: ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو۔ تمھیں ڈھونڈنے جارہی تھی۔''

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا: ''میں اس کے لیے تمھارا بہت ممنون ہوں۔ آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے راستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہوگیا۔ یہی تمھارا گانو ہے؟ یہاں سے گجن پور کتنی دور ہوگا؟''

''بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ رستہ بالکل سیدھا ہے۔ کہیں داہنے بائیں مڑیو نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔''

''یہی تمھارا بچا ہے؟''

''نہیں ایک اور اس سے بڑا ہے۔ جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے کہ جھونپڑیا کہیں اڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے نہیں اترتا۔ کہتا ہے تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا شیطان ہے۔ لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے۔ اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں۔ گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔ کہیں جاتی ہوں من ان بچوں میں لگا رہتا ہے۔''

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے، لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث اندازِ گفتگو، اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا۔ اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہوگئی۔ پوچھا: ''تمھیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہوگئے؟''

عورت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی۔

''ابھی تو کل چھے مہینے ہوئے ہیں بابو جی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا۔ بس بھلے چنگے

ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی، بس آنکھیں بند ہو گئیں۔ نہ کچھ کہا نہ سنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں، سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کو اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔ تب سے بابو جی! گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچوں کو کھلاتی ہوں۔ کھیتی میرے مان کی نہ تھی۔ بیل بدھیے بیچ کر انھیں کے کریا کرم میں لگا دیے۔ بھگوان تمھارے ان دونوں گلاموں کو جلا دے، میرے لیے یہی بہت ہیں۔''

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں، لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقّت طاری ہوئی کہ میں آب دیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ''میری طرف سے یہ بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے لے لو۔ مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی: ''نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجیے۔ میں غریب ہوں، لیکن بھکارن نہیں ہوں۔''

''یہ بھیک نہیں ہے، بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔''

''نہیں بابو جی۔''

''مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔''

''نہیں بابو جی، جس سے بیاہ ہوا اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمھارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ، نہیں دیر ہو جائے گی۔''

میں دِل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل، کور باطن، بے خبر سمجھتا تھا اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیبِ نفس ہے اور محض اعلا ڈگریاں نہیں، تو یہ عورت تعلیم کی معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا: ''تمھیں اس آندھی میں ذرا سا ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟''

عورت مسکرائی: ''ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آ کر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح گنجن پور کے لیے نہ جا پاتے۔ جا کر تمھیں پہنچا آتا۔ تھوڑی خدمت کرتا۔''

گھوڑا اڑا۔ میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اڑ رہا تھا جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے دفتروں سے بھی نہ حاصل ہوئی تھی۔ میں اس مفلس کی

طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے، اڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارۂ زرکو دل کے کسی گوشے میں چھپالوں جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

(۳)

گجن پور ابھی پانچ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ، بیہڑ، بے برگ وبار، گھوڑے کو روکنا پڑا۔ تیزی میں جان کا خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا۔ کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا۔ پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی ایک نئی تہہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ یکا یک سامنے ایک کف دست میدان آ گیا، جس کے پرلے سرے پر گجن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آ رہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے، جو مجھے ہر آفت، ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا وہ بار بار ہنہناتا تھا اور اڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے۔ لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑا اڑا۔ میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہوں گا کہ ایک ریپٹ آپڑی۔ پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی ریپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار ریپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ ریپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا ریپٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ ریپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی کیوں کہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلا کر کہا: ''بڈھے، اور داہنے کو ہو جا۔''

بڈھا چونکا اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں طرف ہو لیا اور پھسل کر پانی میں گر پڑا۔ اسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا۔ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔ میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آ گیا۔ کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا۔ زیادہ پس وپیش کا موقع نہ تھا۔ میں فوراً گھوڑے

سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے۔ میں پانی میں کود پڑا۔ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔ رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی وہ ضرورت سے چوڑی تھی۔ ٹھیکے دار نے دس فٹ چوڑی رپٹ تو بنادی مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا۔ میں بھی ایک غوطہ کھا گیا لیکن تیرنا جانتا تھا، کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا۔ جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اسے لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ دیکھا تو گھوڑا ابھی بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے۔ اس نیم جان لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر کبھی شانے پر کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اٹھا تھا لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا جاتا تھا۔ میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں تو شاید خیال ہو میں خواہ مخواہ تعلّی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرت ہوتی ہے۔ مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالباً میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ ہر لحظہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے۔ مگر میں خوش تھا، کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی، وہ اس وقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی۔ اولے نکل گیے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ رومال سے ساز کو صاف کیا اور گجن پور چلا۔ بے خوف، بے خطر، دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اسی وقت اندھے نے پوچھا: ''تم کون ہو بھائی؟ مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو۔''

میں نے کہا: ''تمھارا خادم ہوں۔''

''تمھارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔''

''وہ کون دیوی ہے؟''

''وہ دیوی پیچھے کے گانو میں رہتی ہے۔''

''تو کیا وہ عورت ہے؟''

''نہیں، میرے لیے تو وہ دیوی ہے۔''

☆☆☆

مالکن

(۱)

شیوداس نے بھنڈار کی کنجی اپنی بہورام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: ''بہو آج سے گرہستی کی دیکھ بھال تمھارے ذمے ہے۔ میر سکھ بھگوان سے نہیں دیکھا گیا۔ نہیں تو کیا جوان بیٹے کو یوں چھین لیتے؟ مگر اس کا کام کرنے والا تو کوئی چاہیے۔ اب بَل توڑ دوں تو گزر نہ ہوگی، اس لیے برجو کا بَل اب میں ہی سنبھالوں گا۔ پھر گھر کی دیکھ بھال کرنے والا، رکھنے اٹھانے والا تمھارے سوا دوسرا کون ہے؟ روؤ مت بیٹا! بھگوان کی جو مرضی تھی وہ ہوا اور جو مرضی ہوگی وہ ہوگا۔ ہمارا تمھارا کیا اختیار ہے۔ میرے جیتے جی تمھیں کوئی ٹیڑھی نگاہوں سے بھی نہ دیکھ سکے گا۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ برجو گیا تو میں تو ابھی بیٹھا ہی ہوں۔''

رام پیاری اور رام دلاری دو حقیقی بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی متھرا اور برجو دو حقیقی بھائیوں سے ہوئی۔ دونوں بہنیں میکے کی طرح سسرال میں بھی محبت اور آرام سے رہنے لگیں۔ شیوداس کو فرصت ملی۔ دن بھر دروازے پر بیٹھا گپ شپ کرتا۔ آباد گھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ دھرم کے کاموں کی طرف طبیعت مائل ہونے لگی۔ لیکن خدا کی مرضی بڑا لڑکا برجو بیمار پڑا اور آج اسے مرے ہوئے پندرہ روز ہو گئے۔ آج اس کے آخری مراسم سے فرصت ملی اور شیوداس نے سچے بہادر کی طرح کارزارِ حیات کے لیے کمر باندھ لی۔ دل میں چاہے اسے کتنا ہی صدمہ ہوا ہو، اسے کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آج اپنی بہو کو دیکھ کر ایک آن کے لیے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ لیکن اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالا اور بھرّائی ہوئی آواز میں اسے دلاسا دینے لگا۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ گھر کی مالکن بن کر بیوہ کے آنسو پچھ جائیں گے۔ کم سے کم اسے محنت تو نہ کرنی پڑے گی۔

رام پیاری نے رقّت آمیز لہجے میں کہا: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے دادا! تم محنت مزدوری کرو اور میں مالکن بن بیٹھوں۔ کام دھندے میں لگی رہوں گی تو دل بہلتا رہے گا۔ بیٹھے بیٹھے رونے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔''

شیر داس نے سمجھایا: ''بیٹا! بھگوان کی مرضی سے تو کسی کا بس نہیں۔ رونے دھونے سے

ہلکان ہونے کے سوااور کیا ہاتھ آئے گا؟ گھر میں بھی تو بیسیوں کام ہیں۔کوئی سادھوسنت آجائے، کوئی مہمان آپہنچے،اس کی خاطر مدارات کے لیے کسی کوتو گھر پر رہنا ہی پڑے گا۔

بہونے حیلے کیے پر شیوداس نے ایک نہ سنی۔

(۲)

شیوداس کے باہر چلے جانے کے بعد مالکن نے کنجی اٹھالی تو اس کے دل میں اختیار اور ذمہ داری کا زبردست احساس پیدا ہوا۔تھوڑی دیر کے لیے شوہر کی جدائی کا صدمہ اس کے دل سے محو ہوگیا۔اس کی چھوٹی بہن اور دیور دونوں کام کرنے گئے ہوئے تھے۔شیوداس باہر تھا۔گھر بالکل خالی تھا۔اس وقت وہ بے فکر ہوکر بھنڈار کو کھول سکتی ہے۔اس میں کیا کیا سامان ہے، کیا کیا چیز ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے تاب ہوگیا۔اس کوٹھری میں وہ کبھی نہیں آئی تھی۔جب کسی کو کچھ دینا یا کسی سے کچھ لینا ہوتا تو شیوداس آکر اس کوٹھری کو کھولتا۔پھر اسے بند کرکے کنجی اپنی کمر میں رکھ لیتا تھا۔رام پیاری کبھی کبھی کواڑ کی درازوں سے اندر جھانکتی تھی مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سارے گھر کے لیے وہ کوٹھری ایک طلسم یا راز تھی، جس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔آج رام پیاری کو وہ راز کھول کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔اس نے باہر کا دروازہ بند کردیا کہ اسے کوئی بھنڈار کھولتے نہ دیکھ لے۔نہیں تو سوچے گا بے ضرورت اس نے کیوں کھولا۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹانے لگے۔اندر پانو رکھا تو اسے اسی طرح کی، لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی جو اسے اپنے کپڑے اور زیور کی پٹاری کے کھولنے میں ہوتی تھی۔ مٹکوں میں گڑ، شکر، گیہوں، جو وغیرہ سب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ایک کنارے بڑے بڑے برتن رکھے ہوئے تھے، جو شادی بیاہ کے موقع پر نکالے جاتے تھے یا مانگے دیے جاتے تھے۔ایک جگہ مال گزاری کی رسیدیں اور لین دین کے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔کوٹھری پر شان وشوکت چھائی ہوئی تھی۔اسی کے سایے میں رام پیاری کوئی آدھ گھنٹے تک اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔لمحہ بہ لمحہ اس کے دل پر نشہ طاری ہوتا گیا۔جب وہ اس کوٹھری سے نکلی تو اس کے دل کی حالت بدلی ہوئی تھی، جیسے کسی نے اس پر سحر کردیا ہو۔

اسی وقت دروازے سے کسی آدمی نے آواز دی۔اس نے فوراً بھنڈارے کا دروازہ بند کیا اور جاکر صدر دروازہ کھول دیا۔دیکھا تو پڑوسن چھنیا کھڑی ایک روپیا قرض مانگ رہی ہے۔

رام پیاری نے بے رخی سے کہا: ''ابھی تو ایک پیسا بھی گھر میں نہیں ہے۔بہن، کام کاج میں سب خرچ ہوگیا۔''

چھنیا حیران رہ گئی۔ چودھری کے گھر میں اس وقت ایک روپیا بھی نہیں ہے۔ یہ یقین کرنے کی بات نہ تھی۔ جس کے یہاں سیکڑوں کا لین دین ہے، اس کا سارا اثاثہ کام کاج میں صَرف نہیں ہوسکتا۔ اگر شیوداس نے یہ حیلہ کیا ہوتا تو اسے تعجب نہ ہوتا۔ رام پیاری تو اپنے سادہ اخلاق کے لیے گانو میں مشہور تھی۔ اکثر شیوداس کی نگاہیں بچا کر ہمسایوں کو ضرورت کی چیزیں دے دیا کرتی تھی۔ ابھی کل ہی اس نے جانکی کو سیر بھر دودھ دے دیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے گہنے تک مانگے دے دیا کرتی تھی۔ بخیل شیوداس کے گھر میں ایسی سخی بہو کا آنا لوگ اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

چھنیا نے منتخب ہوکر کہا: ''ایسا نہ کہو بہن، بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔ نہیں تو تم جانتی ہو کہ میری عادت قرض مانگنے کی نہیں ہے۔ لگان کا ایک روپیا دینا ہے۔ پیادہ دروازے پر کھڑا بک جھک رہا ہے۔ روپیا دے دو تو کسی طرح مصیبت ٹلے۔ میں آج کے آٹھویں روز آکر دے جاؤں گی۔ گانو میں اور کون گھر ہے۔ جہاں مانگنے جاؤں۔''

رام پیاری ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اس کے جاتے ہی رام پیاری شام کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ پہلے چاول، دال چننا وبال معلوم ہوتا تھا اور رسوئی میں جانا سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا۔ کچھ دیر دونوں بہنوں میں جھوڑ ہوتی، آخر میں شیوداس آکر کہتا کہ آج کیا کھانا نہ پکے گا؟ اس وقت دونوں میں سے ایک اٹھتی اور موٹے موٹے ٹکڑ پکا کر رکھ دیتی۔ جیسے بیلوں کا راتب ہو۔ آج رام پیاری تن من سے کھانا پکانے کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ اب وہ گھر کی مالکن ہے۔

اس نے باہر نکل کر دیکھا کتنا کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے۔ بڈھے دادا دن بھر مکھی مارا کرتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ذرا جھاڑو ہی دے ڈالیں اب کیا ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ دروازہ ایسا صاف ہونا چاہیے کہ دیکھ کر دل خوش ہوجائے، یہ نہیں کہ اُبکائی آنے لگے ابھی کہہ دوں تو تنک اٹھیں۔ اچھا! یہ منی ناند سے الگ کیوں کھڑی ہے۔

اس نے منی گائے کے پاس جا کر ناند میں جھانکا، بدبو آرہی تھی۔ ٹھیک ہے۔ معلوم ہوتا ہے مہینوں سے پانی نہیں بدلا گیا ہے۔ اس طرح تو گائے رہ چکی۔ اپنا پیٹ بھر لیا، چھٹی ہوئی اور کسی سے کیا مطلب؟ ہاں دودھ سب کو اچھا لگتا ہے۔ دادا دروازے پر بیٹھے چلم پی رہے ہیں مگر اتنا نہیں ہوتا کہ چار گھڑے پانی ناند میں ڈال دیں۔ مزدور رکھا ہے وہ بھی تین کوڑی کا۔ کھانے کو ڈیڑھ سیر، کام کرتے نانی مرتی ہے۔ آئے تو پوچھتی ہوں ناند میں پانی کیوں نہیں بدلتا؟ رہنا ہو رہے یا جائے، آدمی بہت ملیں گے۔ چاروں طرف تو لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں۔

آخر اس سے نہ رہا گیا۔ گھڑا اٹھا کر پانی لینے چلی۔

شیوداس نے پکارا: ''پانی کیا ہوگا بہو؟ ناند میں پانی بھرا ہوا ہے۔''

پیاری نے کہا: ''ناند کا پانی سڑ گیا ہے۔ منی بھوسے میں منہ نہیں ڈالتی۔ دیکھتے ہو کوس بھر پر کھڑی ہے۔''

شیوداس مسکرایا۔ دوڑ کر بہو کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا۔

(۳)

کئی مہینے گزر گئے۔ پیاری کے اختیار میں آ کر جیسے اس گھر میں بہار آ گئی۔ اندر باہر جہاں دیکھیے ایک لائق منتظم کی سلیقہ شعاری، صفائی پسندی اور خوش مذاقی کے آثار نظر آنے لگے۔ پیاری نے گرہستی کی مشین کی ایسی کنجی کس دی کہ سب ہی پرزے ٹھیک ٹھیک چلنے لگے۔ کھانا پہلے سے اچھا ملتا ہے اور وقت پر ملتا ہے۔ دودھ زیادہ ہوتا ہے، گھی زیادہ ہوتا ہے۔ پیاری نہ خود آرام کرتی ہے نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتی ہے۔ گھر میں کچھ ایسی برکت آ گئی ہے کہ جو چیز مانگو گھر ہی میں نکل آتی ہے۔ آدمی سے لے کر جانور تک سب ہی تندرست نظر آتے ہیں۔ اب وہ پہلی سی حالت نہیں ہے کہ کوئی چیتھڑے لپیٹے پھر رہا ہے، کسی کو گہنے کی دھن سوار ہے۔ ہاں اگر کوئی متردّد و فکر مند اور پریشان ہے تو وہ پیاری ہے۔ پھر بھی سارا گھر اس سے جلتا ہے۔ یہاں تک کہ بوڑھے شیوداس بھی کبھی کبھی اس کی بدگوئی کرتے ہیں۔ کسی کو پہر رات گئے اٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ محنت سے سب جی چراتے ہیں، پھر بھی اتنا سب ہی مانتے ہیں کہ پیاری نہ ہو تو گھر کا کام نہ چلے اور تو اور اب دونوں بہنوں میں اتنا میل نہیں ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ دلاری نے ہاتھوں کے کڑے لا کر پیاری کے سامنے پٹک دیے اور بگڑ کر بولی: ''لے کڑے بھی بھنڈار میں بند کر دے۔''

پیاری نے کڑے اٹھا لیے اور نرم لہجے میں کہا: ''کہہ تو دیا، ہاتھ میں روپے آنے دے بنوا دوں گی۔ ابھی تو ایسے گھس نہیں گئے ہیں کہ آج ہی اتار کر پھینک دیے جائیں۔''

دلاری لڑنے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ بولی: ''تیرے ہاتھ میں کاہے کو کبھی روپے آئیں گے اور کاہے کو کڑے بنیں گے۔ جوڑ جوڑ رکھنے میں مزہ آتا ہے۔''

پیاری نے ہنس کر کہا: ''جوڑ رکھتی ہوں تو تیرے ہی لیے یا میرے کوئی اور بیٹھا ہوا ہے یا میں سب سے زیادہ کھا پہن لیتی ہوں۔ میرا بازو بند کب کا ٹوٹا پڑا ہے۔''

دلاری: ''تم نہ کھاؤ پہنو، نیک نامی تو ہوتی ہے تمھاری۔ یہاں کھانے اور پہننے کے سوا اور کیا ہے؟ ''میں تمھارا حساب کتاب نہیں جانتی۔ میرے کڑے آج بننے کو بھیج دو۔''

پیاری نے بالکل مذاق کے انداز میں پوچھا: ''روپے نہ ہوں تو کہاں سے لاؤں؟''

دلاری نے چیخ کر کہا: ''مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ میں تو کڑے چاہتی ہوں۔''

اسی طرح گھر کے سبھی آدمی اپنے اپنے موقع پر پیاری کو دو چار سخت وست سنا جاتے تھے اور وہ غریب سب کی دھونس ہنس کر برداشت کر لیتی تھی۔ مالکن کا تو یہ فرض ہے کہ سب کی دھونس برداشت کر لے اور کرے وہی جس میں گھر کی بھلائی ہو۔ مالکانہ ذمہ اری کے احساس پر طعن وطنز اور دھمکی کسی چیز کا اثر نہ ہوتا۔ اس کا مالکانہ احساس ان حملوں سے اور بھی قوی ہو جاتا تھا۔ وہ گھر کی منتظمہ ہے۔ سبھی اپنی اپنی تکلیف اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں، جو کچھ وہ کرتی ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔

گانو میں پیاری کی تعریف ہوتی تھی۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔ لیکن تمام گھر کو سنبھالے ہوئے ہے۔ چاہتی تو دوسرا گھر کر کے چین کرتی۔ اس گھر کے واسطے اپنے کو مٹا رہی ہے۔ کبھی کسی سے ہنستی بولتی بھی نہیں۔ جیسے کایا پلٹ ہو گئی۔

چند روز بعد دلاری کے کڑے بن کر آ گئے۔ پیاری خود سنار کے گھر دوڑ دوڑ گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ دلاری اور متھرا دونوں کھیت سے لوٹے۔ پیاری نے نئے کڑے دلاری کو دیے۔ دلاری نہال ہو گئی۔ چٹ پٹ کڑے پہنے اور دوڑی ہوئی جا کر کوٹھری میں متھرا کو کڑے دکھانے لگی۔ پیاری کوٹھری کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ منظر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ دلاری اس سے کل تین ہی سال تو چھوٹی ہے، لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اس کی نظریں گویا اسی منظر پر جم گئیں۔ متاہلانہ زندگی کی وہ حقیقی مسرت، ان کی وہ محبت آگیں محویت، ان کی وہ سرخوشی!

پیاری کی ٹکٹکی سی بندھ گئی۔ یہاں تک کہ چراغ کی دھندلی روشنی میں وہ دونوں اس کی نظر سے غائب ہو گئے۔ اسے اپنی گذشتہ زندگی کا ایک ایک واقعہ نگاہوں کے سامنے بار بار نئی صورت میں سامنے آنے لگا۔ ناگہاں شیوداس نے پکارا: ''بڑی بہو ایک پیسا دو تمبا کو منگاؤں۔''

پیاری کا سلسلہ تصور شکست ہو گیا۔ آنسو پونچھتی ہوئی بھنڈار میں پیسا لینے چلی گئی۔

(۴)

ایک ایک کر کے پیاری کے گہنے اس کے ہاتھ سے نکلتے جاتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا گھر گانو میں سب سے خوش حال سمجھا جائے اور اسی کو اس ہوس کی قیمت دینا پڑتی تھی۔ کبھی مکان کی مرمت کے لیے، کبھی بیلوں کی نئی جوڑی خریدنے کے لیے روپے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور جب بہت توڑ جوڑ کرنے پر بھی کام نہ چلتا تو وہ اپنی کوئی نہ کوئی چیز نکال دیتی اور وہ چیز ایک بار ہاتھ

سے نکل کر پھر واپس نہ آتی۔ وہ چاہتی تو ان میں سے بہت سے خرچوں کو ٹال جاتی لیکن جہاں عزت کی بات آپڑتی وہ دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔ اگر گانو میں ہیٹی ہوگئی تو کیا بات رہی، اسی کی تو بدنامی ہوگی! دلاری کے پاس بھی گہنے تھے، ایک دو چیزیں متھرا کے پاس بھی تھیں، لیکن پیاری ان کی چیزیں نہ چھوتی۔ ان کے کھانے پہننے کے دن ہیں، وہ اس جھگڑے میں کیوں پھنسیں۔ دلاری کے لڑکا پیدا ہوا تو پیاری نے دھوم دھام کے ساتھ خوشی منانے کا ارادہ کیا۔

شیوداس نے مخالفت کی: ''کیا فائدہ؟ جب بھگوان کی کرپا سے بیاہ بارات کا موقع آئے گا تو دھوم دھام کر لینا۔''

پیاری کا حوصلہ مند دل بھلا کیوں مانتا؟ بولی: ''کیسی بات کرتے ہو دادا! پہلونٹی کے لڑکے کے لیے بھی دھوم دھام نہ ہوئی تو کب ہوگی؟ دل تو نہیں مانتا پر دنیا کیا کہے گی؟ نام بڑے درشن تھوڑے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی، اپنا تمام سامان کر لوں گی۔''

''گہنے کے سر جائے گی اور کیا؟'' شیوداس نے فکرمند ہو کر کہا۔ ''اس طرح ایک روز تار بھی نہ بچے گا۔ کتنا سمجھایا بیٹا! بھائی بھاوج کسی کے نہیں ہوتے۔ اپنے پاس دو چیزیں رہیں گی تو سب منہ تکیں گے، نہیں تو کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گا۔''

پیاری نے ایسا منہ بنایا گویا وہ ایسی بوڑھی باتیں بہت سن چکی ہے۔ بولی: ''جو اپنے ہیں وہ اپنے ہیں۔ وہ بات بھی نہ پوچھیں جب بھی اپنے ہی رہتے ہیں۔ میرا دھرم میرے ساتھ ہے، ان کا دھرم ان کے ساتھ ہے۔ مر جاؤں گی تو کیا سینے پر لاد کے لے جاؤں گی۔''

دھوم دھام سے لڑکا پیدا ہونے کی خوشی منائی گئی۔ برھی کے روز ساری برادری کا کھانا ہوا۔ لوگ کھا پی کر چلے گئے تو پیاری دن بھر کی تھکی ماندی آنگن میں ٹاٹ کا ایک ٹکڑا ڈال کر کمر سیدھی کرنے لگی۔ آنکھ لگ گئی۔ متھرا اسی وقت گھر میں آیا۔ نومولود بچے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ دلاری زچہ خانے سے نکل چکی تھی۔ حمل کی حالت میں اس کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی اتر گیا تھا۔ لیکن آج چہرے پر صحت کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ مادرانہ غرور و ناز نے اعضا میں ایک نئی روح پیدا کر دی تھی۔ زچہ خانے کی احتیاط اور مقوی چیزوں کے استعمال نے بدن کو چکنا دیا تھا۔ متھرا اسے آنگن میں دیکھتے ہی قریب آ گیا اور ایک بار پیاری کی طرف دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ سو گئی ہے، بچے کو گود میں لے لیا اور لگا اس کا منہ چومنے۔

آہٹ پا کر پیاری کی آنکھ کھل گئی لیکن نیند کے بہانے وہ نیم باز آنکھوں سے یہ پر لطف تماشا دیکھنے لگی۔ ماں اور باپ دونوں باری باری سے بچے کو چومتے اور گلے لگاتے اور اس کے منہ کو تکتے تھے۔ کیسی پر کیف مسرت تھی۔ پیاری کی تشنہ تمنا ایک آن کے لیے مالکانہ حیثیت کو بھول گئی۔

جس طرح لگام سے منہ بند، بوجھ سے لدا ہوا، ہانکنے والے کے کوڑے سے تکلیف زدہ، دوڑتے دوڑتے بے دم گھوڑا ہنہناہٹ کی آواز سن کر کان کھڑے کر لیتا ہے، وہ اپنی حالت کو فراموش کر کے ایک دبی ہوئی ہنہناہٹ سے اس کا جواب دیتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی پیاری کی حالت ہوگئی۔ اس کی مادریت جو پنجرے میں بند خاموش، بے جان پڑی ہوئی تھی، قریب سے گزرنے والی مادریت کی چہکار سے بیدار ہوگئی اور تفکرات کے اس پنجرے سے نکلنے کے لیے بازو پھڑ پھڑانے لگی۔

متھرا نے کہا: ''یہ میرا لڑکا ہے۔''

دلاری نے بچے کو سینے سے چمٹا کر کہا: ''ہاں، ہے کیوں نہیں۔ تم ہی نے تو نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے۔ مصیبت تو میں نے بھگتی، باپ کہلانے کے لیے تم آ گئے۔''

متھرا: ''میرا لڑکا نہ ہوتا تو میری صورت کا کیوں ہوتا؟ صورت وشکل سب میری سی ہے کہ نہیں۔''

دلاری: ''اس سے کیا ہوتا ہے۔ بیج بنیے کے گھر سے آتا ہے، کھیت کسان کا ہوتا ہے۔ پیداوار بنیے کی نہیں ہوتی۔ کسان کی ہوتی ہے۔''

متھرا: ''باتوں میں تم سے کوئی نہ جیتے گا۔ میرا لڑکا بڑا ہو جائے گا تو میں دروازے پر بیٹھ کر مزے سے حقہ پیا کروں گا۔''

دلاری: ''میرا لڑکا پڑھے لکھے گا۔ کوئی بڑا عہدہ حاصل کرے گا۔ تمھاری طرح دن بھر بیل کے پیچھے نہ چلے گا۔ مالکن سے کہنا ہے کل ایک جھولا بنوا دیں۔''

متھرا: ''اب بہت سویرے نہ اٹھا کرنا اور کلیجہ پھاڑ کر کام بھی نہ کرنا۔''

دلاری: ''یہ مہارانی جینے دے گی۔''

متھرا: ''مجھے تو اس بے چاری پر ترس آتا ہے۔ اس کے کون بیٹھا ہے۔ ہمیں لوگوں کے لیے تو مرتی ہے۔ بھیا ہوتے تو اب تک دو تین لڑکوں کی ماں ہوگئی ہوتی۔''

پیاری کے گلے میں آنسوؤں کا ایک ایسا سیلاب امڈا کہ اس کے روکنے میں اس کا تمام جسم کانپ اٹھا۔

اس کی بیوگی کا سونا پن کسی خوف ناک جانور کی طرح اسے نگلنے لگا۔ تصور اس بنجر زمین میں ہرا، بھرا باغ لگانے لگا۔

یکا یک شیوداس نے اندر آ کر کہا: ''بڑی بہو، کیا سو گئی۔ باجے والوں کو ابھی کھانے کو نہیں ملا۔ کیا کہہ دوں؟''

(۵)

کچھ دنوں بعد شیوداس بھی مر گیا۔ ادھر دلاری کے دو بچے ہوئے۔ وہ بھی زیادہ تر بچوں کی پرورش و پرداخت میں رہنے لگی۔ کھیتی کا کام مزدوروں پر آ پڑا۔ متھرا مزدور تو اچھا تھا مگر منتظم اچھا نہ تھا۔ اسے آزادانہ طور پر کام لینے کا موقع نہ ملا تھا۔ خود پہلے بھائی کی نگرانی میں کام کرتا رہا۔ بعد کو باپ کی نگرانی میں کام کرنے لگا۔ کھیتی کا انداز بھی نہیں جانتا تھا۔ وہی مزدور اس کے یہاں ٹکتے تھے جو محنتی نہیں۔ خوشامد کرنے میں ہوشیار ہوتے تھے، اس لیے اب پیاری کو دو چار چکر کھیت کے بھی لگانے پڑتے تھے۔ کہنے کو تو وہ اب بھی مالکن تھی مگر حقیقت میں گھر بھر کی خدمت گذار تھی۔ مزدور بھی اس سے تیوریاں بدلتے۔ زمین دار کا پیادہ بھی اس پر دھونس جماتا، کھانے میں بھی کفایت کرنی پڑتی۔ لڑکوں کو جتنی بار مانگیں کچھ نہ کچھ چاہیے۔ دلاری بچوں والی تھی، اسے بھی پوری خوراک چاہیے۔ متھرا گھر کا سردار تھا۔ اس حق کو اس سے کون چھین سکتا۔ مزدور بھلا کیوں رعایت کرنے لگے۔ ساری کسر بے چاری پیاری پر نکلتی تھی۔ اس کی ایک ذات فاضل تھی۔ آدھا ہی پیٹ کھائے جب بھی کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا تھا۔ تیس برس کی عمر میں اس کے بال سفید ہوگئے تھے، کمر جھک گئی، آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی۔ مگر وہ خوش تھی۔ مالک ہونے کا احساس ان تمام زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔

ایک روز متھرا نے کہا: ''بھابی، اب تو کہیں پردیس جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں تو کمائی میں کوئی برکت نہیں۔ کسی طرح پیٹ کی روٹیاں چلی جاتی ہیں، وہ بھی رودھو کر۔ کئی آدمی پورب سے آئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہاں دو تین روپے روز کی مزدوری ہوتی ہے۔ چار پانچ سال بھی رہ گیا تو مالا مال ہو جاؤں گا۔ اب لڑکے بالے ہوئے، ان کے لیے تو کچھ کرنا ہی چاہیے۔''

دلاری نے تائید کی: ''ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے، لڑکوں کو پڑھائیں گے لکھائیں گے۔ ہماری تو کسی طرح کٹ گئی، لڑکوں کو تو آدمی بنانا ہے۔''

پیاری یہ رائے سن کر حیران رہ گئی۔ ان کا منہ تکنے لگی۔ اس سے پہلے اس طرح کی بات چیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ انھیں یہ دھن کیسے سوار ہوگئی۔ اسے شک ہوا کہ شاید میری وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔

بولی: ''تو میں تو جانے کو نہ کہوں گی۔ آگے تمھاری جیسی خوشی ہو۔ لڑکوں کے پڑھانے لکھانے کے لیے یہاں بھی اسکول ہیں۔ پھر کیا ہمیشہ ہی ایسا وقت رہے گا۔ دو تین سال میں کھیتی بن گئی تو سب کچھ ہو جائے گا۔''

متھر: ''اتنے روز کھیتی کرتے ہو گئے۔ جب اب تک نہ بنی تو اب کیا بن جائے گی۔ اسی طرح ایک روز چل دیں گے۔ دل کی دل میں رہ جائے گی۔ پھر اب ہاتھ پانو بھی تو تھک رہے ہیں۔ یہ کھیتی کون سنبھالے گا۔ لڑکوں کو اس چکّی میں جوت کر ان کی زندگی خراب کرنی نہیں چاہتا۔''

پیاری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: ''بھیا، گھر پر جب تک آدھی ملے ساری کے لیے نہ دوڑنا چاہیے۔ اگر میری طرف سے کوئی بات ہو تو اپنا گھر بار اپنے ہاتھ میں لے لو۔ مجھے ایک ٹکڑا دے دینا۔ پڑی رہوں گی۔''

متھر اگلو گیر آواز سے بولا: ''بھابی، یہ تم کیا کہتی ہو۔ تمھارے ہی سنبھالے یہ گھر اب تک سنبھلا ہے نہیں تو ختم ہو چکا ہوتا۔ اس گرہستی کے پیچھے تم نے اپنے کو مٹی میں ملا دیا۔ اپنا جسم تک گھلا ڈالا۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں۔ ہم لوگوں کو جانے دو۔ بھگوان نے چاہا تو گھر پھر سنبھل جائے گا۔ تمھارے لیے ہم برابر خرچ بھیجتے رہیں گے۔''

پیاری نے کہا: ''اگر ایسا ہی ہے تو تم چلے جاؤ۔ بال بچوں کو کہاں کہاں باندھے پھرو گے؟''

دلاری بولی: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے بہن۔ یہاں دیہات میں لڑکے کیا پڑھیں لکھیں گے۔ بچوں کے بغیر وہاں ان کا جی بھی نہ لگے گا۔ دوڑ دوڑ کر گھر آئیں گے اور ساری کمائی ریل کھا جائے گی۔ پردیس میں اکیلے جتنا خرچ ہوگا اتنے میں سارا گھر آرام سے رہے گا۔''

پیاری بولی: ''تو میں ہی یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ مجھے بھی لیتے چلو۔''

دلاری اسے ساتھ لے چلنے کو تیار نہ تھی۔ کچھ روز زندگی کا لطف اٹھانا چاہتی تھی۔ اگر پردیس میں بھی یہی ضابطہ رہا تو جانے سے فائدہ ہی کیا؟ بولی: ''بہن، تو چلتی تو کیا بات تھی۔ پھر یہاں تو سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ تم تو کچھ نہ کچھ دیکھ بھال کرتی ہی رہو گی۔''

روانگی کی تاریخ سے ایک روز پہلے ہی رام پیاری نے رات بھر جاگ کر حلوا پوری پکائی۔ جب سے اس گھر میں آئی کبھی تو ایک روز کے لیے بھی تنہا رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دونوں بہنیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔ آج اس ہولناک موقع کو سامنے آتے دیکھ کر پیاری کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ متھرا خوش ہے۔ لڑکے باہر جانے کی خوشی میں کھانا پینا بھولے ہوئے ہیں، تو اس کے جی میں آتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح بے غم رہے، محبت و ہمدردی کو پیروں سے کچل ڈالے، لیکن وہ محبت جس غذا کو کھا کھا کر پلی تھی اسے سامنے سے ہٹتے جاتے دیکھ کر بے قرار ہونے سے نہ روک سکی۔ دلاری تو اس طرح بے فکر بیٹھی تھی جیسے کوئی میلا دکھانے جا رہی تھی۔ نئی چیزوں کے دیکھنے، نئی دنیا کی سیر

کرنے کے شوق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ پیاری کے سر انتظام کا بار تھا۔ دھوبی کے گھر سے سب کپڑے آئے ہیں یا نہیں۔ کون کون سے برتن ساتھ جائیں گے۔ سفر خرچ کے لیے کتنے روپے کی ضرورت ہوگی۔ ایک بچے کو کھانسی آ رہی تھی، دوسرے کو کئی روز سے دست آ رہے تھے۔ ان دونوں کی دواؤں کو کوٹنا پیسنا وغیرہ سیکڑوں کام اسے مصروف کیے ہوئے تھے۔ لاولد ہو کر بھی وہ بچوں کی داشت و پرداخت میں دلاری سے ہوشیار تھی۔ ''دیکھو، بچوں کو زیادہ مارنا پیٹنا مت۔ مارنے سے بچے ضدی اور بے حیا ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ آدمی کو بچہ بن جانا پڑتا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے، کبھی ہنسنا پڑتا ہے۔ اگر تم چاہو کہ ہم آرام سے پڑے رہیں اور بچے چپ بیٹھے رہیں، ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں تو یہ نہیں ہو سکتا۔ بچے تو طبیعت کے تیز ہوتے ہیں۔ انھیں کسی نہ کسی کام میں پھنسائے رکھو۔ دھیلے کا ایک کھلونا ہزار گھڑکیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔''

دلاری ان ہدایتوں کو اس بے توجہی سے سن رہی تھی گویا کوئی پاگل بک رہا ہو۔

رخصت کا روز پیاری کے لیے امتحان کا دن تھا۔ اس کے جی میں آتا تھا کہ کہیں چلی جائے تا کہ وہ منظر نہ دیکھنا پڑے۔ ہائے گھڑی بھر میں یہ گھر سونا ہو جائے گا۔ وہ دن بھر گھر میں تنہا پڑی رہے گی۔ کس سے ہنسے گی، کس سے بولے گی؟ یہ سوچ کر اس کا دل لرز جاتا۔ جوں جوں وقت قریب آتا تھا اس کے حواس معطل ہوتے جاتے تھے۔ وہ کام کرتے کرتے جیسے کھو جاتی تھی اور ٹکٹکی باندھ کر کسی چیز کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی موقع پا کر تنہائی میں جا کر تھوڑا سا رو لیتی تھی۔ دل کو سمجھا رہی تھی کہ یہ لوگ اپنے ہوتے تو کیا اس طرح جاتے۔ یہ مانا کہ ناتا ہے مگر کسی پر کوئی زور تو نہیں۔ دوسروں کے لیے کتنا ہی مرو پھر بھی اپنے نہیں ہوتے۔ پانی تیل میں کتنا ہی ملے، پھر بھی الگ ہی رہے گا۔ بچے نئے نئے کپڑے پہنے نواب بنے گھوم رہے تھے۔ پیاری انھیں پیار کرنے کے لیے گود میں لینا چاہتی تھی تو رونے کا سا منہ بنا کر ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتے۔ وہ کیا جانتی تھی کہ ایسے موقع پر اکثر بچے بھی ایسے ہی بے مروّت ہو جاتے ہیں۔ دس بجتے بجتے دروازے پر بیل گاڑی آ گئی۔ لڑکے پہلے ہی سے اس پر جا بیٹھے۔ گانو کے کتنے ہی مرد عورتیں ملنے آئیں۔ پیاری کو اس وقت ان کا آنا برا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دلاری سے تھوڑی دیر تنہائی میں گلے مل کر رونا چاہتی تھی۔ متھرا سے ہاتھ جوڑ کر کہنا چاہتی تھی کہ میری کھوج خبر لیتے رہنا، تمھارے سوا اب دنیا میں میرا کون ہے؟ لیکن گڑبڑ میں اسے ان باتوں کا موقع نہ ملا۔ متھرا اور دلاری دونوں گاڑیوں میں جا بیٹھے اور پیاری دروازے پر کھڑی روتی رہ گئی۔ وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ اسے گانو کے باہر تک پہنچانے کا بھی ہوش نہ رہا۔

(۶)

کئی روز تک پیاری بے ہوش سی پڑی رہی۔ نہ گھر سے نکلی، نہ چولھا جلایا، نہ ہاتھ منہ دھویا۔ اس کا ہلوایا جوکھو بار بار آ کر کہتا: ''مالکن اٹھو، منہ ہاتھ دھوؤ۔ کچھ کھاؤ پیو۔ کب تک اس طرح پڑی رہوگی؟''

اس طرح کی تسلی گانو کی اور عورتیں بھی دیتی تھیں لیکن ان کی تسلی میں ایک قسم کے بغض کا انداز پایا جاتا تھا اور جوکھو کی آواز میں سچی ہمدردی جھلکتی تھی۔ جوکھو کام چور، باتونی اور نشہ باز تھا۔ پیاری اُسے برابر ڈانٹتی رہتی تھی۔ دو ایک بار اسے نکال بھی چکی تھی مگر متھرا کی سفارش سے پھر رکھ لیا تھا۔ آج بھی جوکھو کی ہمدردی بھری باتیں سن کر جھنجھلائی۔ یہ کام کرنے کیوں نہیں جاتا۔ یہاں میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ مگر اسے جھڑکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اسے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ پھل کانٹے دار درخت میں بھی ملیں تو کیا انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ طبیعت بہلنے لگی۔ زندگی کا کاروبار جاری ہوا۔ اب کھیتی کا سارا بار پیاری پر تھا۔ لوگوں نے رائے دی کہ ایک ہل توڑ دو اور کھیتوں کو اٹھا دو۔ لیکن پیاری کی وضع داری یوں ڈھول پیٹ کر اپنی شکست قبول نہ کر سکتی تھی۔ تمام کام سابق کی طرح چلنے لگے۔ ادھر متھرا کے خط و کتابت نہ کرنے سے اس کے جذبات کو اور اشتعال ہوا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے بھروسے بیٹھی ہوں۔ یہاں اس کے کھلانے کا بھی دعوا رکھتی ہوں۔ اس کے بھیجنے سے مجھے کوئی خزانہ مل جاتا۔ اسے اگر میری فکر نہیں ہے تو میں اس کی کب پروا کرتی ہوں۔ گھر میں تو اب کوئی زیادہ کام رہا نہیں۔ پیاری تمام دن کھیتی باڑی کے کاموں میں لگی رہتی۔ خربوزے بوئے تھے۔ وہ خوب پھلے اور خوب بکے۔ پہلے سب دودھ گھر میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اب بکنے لگا۔ پیاری کے خیالات میں بھی ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ اب صاف ستھرے کپڑے پہنتی، مانگ چوٹی کی طرف سے بھی اتنی بے توجہ نہ تھی۔ زیوروں کا بھی شوق ہوا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی اس نے اپنے گروی گہنے چھڑائے اور کھانے میں بھی احتیاط کرنے لگی۔ تالاب پہلے کھیتوں کو سیراب کر کے خود خالی ہو جاتا تھا۔ اب نکاس کی نالیاں بند ہو گئی تھیں۔ تالاب میں پانی جمع ہونے لگا۔ اس میں ہلکی ہلکی لہریں بھی تھیں، کھلے ہوئے کمل بھی تھے۔ ایک روز جوکھو کنویں سے لوٹا تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ پیاری نے پوچھا: ''اب تک وہاں کیا کرتا رہا؟''

جوکھو نے کہا: ''چار کیاریاں بچ رہی تھیں، میں نے سوچا دس موٹ اور کھینچ دوں۔ کل کا جھنجھٹ کون رکھے۔''

جوکھو اب کچھ دنوں سے کام میں جی لگانے لگا تھا۔ جب تک مالک اس کے سر پر سوار رہتے تھے وہ حیلے بہانے کرتا تھا۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ پیاری سارے دن کنویں پر تھوڑے ہی رہ سکتی تھی، اس لیے اب اس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا۔ پیاری نے پانی کا لوٹا رکھتے ہوئے کہا: ''اچھا ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ آدمی جان رکھ کر کام کرتا ہے۔ ہائے ہائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کھیت آج نہ ہوتے کل ہوتے۔ کیا جلدی تھی؟''

جوکھو نے سمجھا پیاری بگڑ رہی ہے۔ اس نے تو اپنی سمجھ میں کارگذاری کی تھی اور وہ سمجھا تھا تعریف ہوگی۔ یہاں اعتراض ہوا۔ چڑ کر بولا: ''مالکن تم داہنے بائیں دونوں طرف چلتی ہو۔ جو بات نہیں سمجھتی ہو اس میں کیوں کودتی ہو؟ کل کے لیے تو اونچے کے کھیت پڑے سوکھ رہے ہیں۔ آج بڑی مشکل سے کنواں خالی ہوا ہے۔ سویرے میں نہ پہنچتا تو کوئی اور آ کر ڈٹ جاتا۔ پھر ہفتہ بھر تک راہ دیکھنی پڑتی۔ تب تک تو سب اوکھ بدا ہو جاتی۔''

پیاری اس کی سادگی پر ہنس کر بولی: ''ارے تو میں تجھے کچھ کہہ تھوڑی ہی رہی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کر کہیں بیمار پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

جوکھو: ''کون بیمار پڑ جائے گا؟ بیس برس سے کبھی سر تک تو نہیں دکھا۔ آیندہ کی نہیں جانتا۔ کہو رات بھر کام کرتا رہوں۔''

پیاری ''میں کیا جانوں۔ تمھیں آئے دن بیٹھے رہتے تھے اور پوچھا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ بخار آ گیا تھا۔ پیٹ میں درد تھا۔''

جوکھو جھینپتا ہوا بولا: ''وہ باتیں جب تھیں جب مالک لوگ چاہتے تھے اسے پیس ڈالیں۔ اب تو جانتا ہوں میرے ہی سر ہے۔ میں نہ کروں گا تو چوپٹ ہو جائے گا۔''

پیاری ''میں کیا دیکھ بھال نہیں کرتی؟''

جوکھو ''تم بہت کرو گی تو دو وقت چلی جاؤ گی۔ تمام دن تم وہاں بیٹھی تو نہیں رہ سکتیں۔''

پیاری کو اس کی اخلاص بھری باتوں نے فریفتہ کر لیا۔ بولی: ''اتنی رات گئے چولھا جلاؤ گے۔ بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟''

جوکھو نے منہ دھوتے ہوئے کہا: ''تم بھی خوب کہتی ہو مالکن! اپنے پیٹ بھر کو تو ہوتا نہیں، بیاہ کر لوں۔ سوا سیر کھاتا ہوں۔ ایک وقت پورا سوا سیر۔ دونوں وقت کے لیے ڈھائی سیر چاہیے۔''

پیاری: ''اچھا آج میری رسوئی میں کھاؤ۔ دیکھوں کتنا کھاتے ہو؟''

جوکھو نے گلوگیر آواز میں کہا: ''نہیں مالکن! تم پکاتے پکاتے تھک جاؤ گی۔ ہاں آدھ سیر

کی دو روٹیاں پکا دو تو کھالوں۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ بس آٹا گوندھ کر دو روٹ بنالیتا ہوں اور اوپر سے سینک لیتا ہوں۔ کبھی میٹھے سے، کبھی پیاز سے کھالیتا ہوں اور آ کر پڑ رہتا ہوں۔''

پیاری: ''میں تمھیں آج پھلکے کھلاؤں گی۔''

جوکھو: ''تب تو ساری رات کھاتے ہی گزر جائے گی۔''

پیاری: ''بکومت، جلدی آ کر بیٹھ جاؤ۔''

جوکھو: ''ذرا بیلوں کو چارہ پانی دیتا آؤں تو بیٹھوں۔''

(۷)

جوکھو اور پیاری میں ٹھنی ہوئی تھی۔

پیاری نے کہا: ''میں کہتی ہوں کہ دھان رو پنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جھڑی لگ جائے تو کھیت ڈوب جائے۔ بارش رک جائے تو کھیت سوکھ جائے۔ جوار، باجرا، سن، ارہر تو ہیں، دھان نہ سہی۔''

جوکھو نے اپنے کندھے پر پھاوڑا رکھتے ہوئے کہا: ''جب سب کا ہوگا تو میرا بھی ہوگا، سب کا ڈوب جائے گا تو میرا بھی ڈوب جائے گا۔ میں کیوں کسی سے پیچھے رہوں؟ بابا کے زمانے میں پانچ بیگھے سے کم نہیں رو پا جاتا تھا۔ برجو بھیا نے اس میں ایک دو بیگھے اور بڑھا دیے۔ متھرا نے بھی ہر سال تھوڑے بہت روپے۔ تو کیا میں سب سے گیا گزرا ہوں۔ میں پانچ بیگھے سے کم نہ لگاؤں گا۔''

''تب گھر کے دو جوان کام کرنے والے تھے۔''

''میں تنہا ان دونوں کے برابر کھاتا ہوں۔ دونوں کے برابر کام کیوں نہ کروں گا؟''

''چل جھوٹا کہیں کا۔ کہتا تھا دو سیر کھاتا ہوں۔ چار سیر کھاتا ہوں۔ آدھ سیر میں ہی رہ گیا۔''

''کسی روز تولو تو معلوم ہو۔''

''تولا ہے، بڑے کھانے والے! میں کہے دیتی ہوں دھان نہ روپو، مزدور ملیں گے نہیں، تمھیں ہلکان ہونا پڑے گا۔''

''تمھاری بلا سے میں ہلکان ہوں گا نا! یہ بدن کس روز کام آئے گا؟''

پیاری نے اس کے کندھے سے پھاوڑا لے لیا اور بولی: ''پہر رات سے پہر رات تک تال میں رہو گے نہ، میرا دل گھبرائے گا۔''

جوکھو کو دل کے گھبرانے کا تجربہ نہ تھا۔ کوئی کام نہ ہو تو آدمی پڑ کر سو رہے، دل کیوں گھبرائے گا۔ بولا: ''جی گھبرائے تو سو رہنا۔ میں گھر رہوں گا تب تو اور جی گھبرائے گا۔ میں بیکار بیٹھتا ہوں تب مجھے بار بار کھانے کی سوجھتی ہے۔ باتوں میں دیر ہو رہی ہے۔ اور بادل گھرے آتے ہیں۔''

پیاری نے کہا: ''اچھا کل جانا۔ آج بیٹھو۔''

جوکھو نے گویا مجبور ہو کر کہا: ''اچھا بیٹھ گیا۔ کہو کیا کہتی ہو؟''

پیاری نے تمسخر کے انداز سے پوچھا: ''کہنا کیا ہے، میں تم سے پوچھتی ہوں اپنا بیاہ کیوں نہیں کر ڈالتے۔ میں اکیلی مرا کرتی ہوں۔ تب ایک سے دو تو ہو جائیں گے۔''

جوکھو شرماتا ہوا بولا: ''تم نے پھر وہی بات چھیڑ دی مالکن! کس سے بیاہ کروں؟ میں ایسی جورو لے کر کیا کروں جو گہنے کے لیے جان کھاتی رہے۔''

پیاری: ''یہ تو تم نے بڑی کڑی شرط لگائی۔ ایسی عورت کہاں ملیں گی جو گہنا نہ چاہتی ہو۔''

جوکھو: ''یہ میں تھوڑا ہی کہتا ہوں کہ گہنا نہ مانگے۔ ہاں میری جان نہ کھائے۔ تم نے تو کبھی گہنے کے لیے ضد نہیں کی، بلکہ اپنے گہنے دوسروں کو دے دیے۔''

پیاری کے رخسار پر ہلکا سا رنگ آ گیا، بولی: ''اچھا اور کیا چاہتے ہو؟''

جوکھو: ''میں کہنے لگوں گا تو بگڑ جاؤ گی۔''

پیاری کی آنکھوں میں شرم کی ایک لہر دوڑ گئی، بولی: ''بگڑنے کی بات ہو گی تو ضرور بگڑوں گی۔''

جوکھو: ''تو میں نہ کہوں گا۔''

پیاری نے پیچھے کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا: ''کہو گے کیسے نہیں۔ میں کہلا کر چھوڑوں گی۔''

جوکھو: ''اچھا تو سنو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمھاری طرح ہو۔ ایسی ہی لجانے والی ہو، ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو، ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو، ایسی ہی کفایت شعار ہو، ایسی ہی ہنس مکھ ہو۔ بس ایسی مورت ملے گی تو بیاہ کروں گا۔ نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔''

پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا پیچھے ہٹ کر بولی: ''تم بڑے دل لگی باج ہو۔''

☆☆☆

نئی بیوی

(۱)

ہمارا جسم پرانا ہے لیکن اس میں ہمیشہ نیا خون دوڑتا رہتا ہے۔ اس نئے خون پر زندگی قائم ہے۔ دنیا کے قدیم نظام میں یہ نیا پن اس کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک ٹہنی میں، ایک ایک قطرے میں، تار میں چھپے ہوئے نغمے کی طرح گونجتا رہتا ہے اور یہ سو سال کی بڑھیا آج بھی نئی دلہن بنی ہوئی ہے۔

جب سے لالہ ڈنگا مل نے نئی شادی کی ہے ان کی جوانی از سر نو عود کر آئی ہے۔ جب پہلی بیوی بقیدِ حیات تھی وہ بہت کم گھر رہتے تھے۔ صبح سے دس گیارہ بجے تک تو پوجا پاٹ ہی کرتے رہتے تھے۔ پھر کھانا کھا کر دکان چلے جاتے۔ وہاں سے ایک بجے رات کو لوٹتے اور تھکے ماندے سو جاتے۔ اگر لیلا کبھی کہتی کہ ذرا اور سویرے آجایا کرو تو بگڑ جاتے: ''تمھارے لیے کیا دکان بند کر دوں یا روزگار چھوڑ دوں۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ ایک لوٹا جل چڑھا کر لکشمی کو خوش کر لیا جائے۔ آج کل لکشمی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑتا ہے، تب بھی ان کا منہ سیدھا نہیں ہوتا۔'' لیلا بیچاری خاموش ہو جاتی۔

ابھی چھ مہینے کی بات ہے۔ لیلا کو زور کا بخار تھا۔ لالہ جی دکان پر چلنے لگے تو لیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''دیکھو میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ذرا سویرے آجانا۔''

لالہ جی نے پگڑی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور بولے: ''اگر میرے بیٹھے رہنے سے تمھارا جی اچھا ہو جائے تو میں دکان نہ جاؤں گا۔''

لیلا رنجیدہ ہو کر بولی: ''میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم دکان نہ جاؤ۔ میں تو ذرا سویرے آجانے کو کہتی ہوں۔''

''تو کیا میں دکان پر بیٹھ کر موج کرتا ہوں؟''

لیلا کچھ نہ بولی۔ شوہر کی یہ بے اعتنائی اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ادھر کئی دن سے اس کو دل دوز تجربہ ہو رہا تھا کہ اس گھر میں اس کی قدر نہیں ہے۔ اگر اس کی جوانی ڈھل چکی تھی تو اس کا کیا قصور تھا۔ کس کی جوانی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ لازم تو یہ تھا کہ پچیس سال کی رفاقت اب ایک گہرے روحانی تعلق میں تبدیل ہو جاتی، جو ظاہر سے بے نیاز رہتی ہے، جو عیب میں بھی حسن دیکھنے

لگتی ہے، جو پکے پھل کی طرح زیادہ شیریں، زیادہ خوشنما ہو جاتی ہے۔ لیکن لالہ جی کا تاجر دل ہر ایک چیز کو تجارت کے ترازو پر تولتا تھا۔ بوڑھی گائے جب نہ دودھ دے سکتی ہو نہ بچے تو اس کے لیے گئوشالہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ان کے خیال میں لیلا کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ گھر کی مالکن بنی رہے۔ آرام سے کھائے پیے اور پڑی رہے۔ اسے اختیار ہے چاہے جتنے زیور بنوائے، چاہے جتنی خیرات اور پوجا کرے۔ روزے رکھے، صرف ان سے دور رہے۔ فطرت انسانی کی نیرنگیوں کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ لالہ جی جس دلجوئی اور حظ سے لیلا کو محروم رکھنا چاہتے تھے خود اسی کے لیے ابلہانہ سرگرمی سے متلاشی رہتے تھے۔ لیلا چالیس کی ہو کر بوڑھی سمجھ لی گئی تھی مگر وہ پینتالیس سال کے ہو کر ابھی جوان تھے۔ جوانی کے ولولوں اور مسرتوں سے بے نیاز لیلا سے اب انھیں ایک طرح کی کراہت ہوتی تھی اور وہ غریب جب اپنی خامیوں کے حسرت ناک احساس کی وجہ سے فطری بے رحمیوں کے ازالے کے لیے رنگ و روغن کی آڑ لیتی تو وہ اس کی بوالہوسی سے اور بھی متنفر ہو جاتے۔

''چہ خوش! سات لڑکوں کی تو ماں بن گئی، بال کھچڑی ہو گئے اور چہرہ دھلے ہوئے فلالین کی طرح پُرشکن ہو گیا، مگر آپ کو ابھی مہادر اور سیندور، مہندی اور ابٹن کی ہوس باقی ہے۔ عورتوں کی بھی کیا فطرت ہے! نہ جانے کیوں آرایش پر اس قدر جان دیتی ہیں۔ پوچھو اب تمھیں اور کیا چاہیے؟ کیوں نہیں دل کو سمجھا لیتیں کہ جوانی رخصت ہو گئی اور ان تدبیروں سے اسے واپس نہیں بلایا جا سکتا۔'' لیکن وہ خود جوانی کا خواب دیکھتے رہتے تھے۔ طبیعت جوانی سے سیر نہ ہوتی۔ جاڑوں میں کشتوں اور معجونوں کا استعمال کرتے رہتے تھے۔ ہفتہ میں دو بار خضاب لگاتے اور کسی ڈاکٹر سے بندر کے غدودوں کے متعلق خط و کتابت کر رہے تھے۔

لیلا نے انھیں شش و پنج کی حالت میں کھڑا دیکھ کر مایوسانہ انداز سے کہا:

''کچھ بتلا سکتے ہو، کے بجے آؤ گے؟''

لالہ جی نے ملائم لہجے میں کہا: ''تمھاری طبیعت آج کیسی ہے؟''

لیلا کیا جواب دے؟ اگر کہتی ہے بہت خراب ہے تو شاید یہ حضرت یہیں بیٹھ جائیں اور اسے جلی کٹی سنا کر اپنے دل کا بخار نکالیں۔ اگر کہتی ہے اچھی ہوں تو شاید بے فکر ہو کر دو بجے رات کی خبر لائیں۔ ڈرتے ڈرتے بولی: ''اب تک تو اچھی تھی لیکن اب کچھ بھاری ہو رہی ہے۔ لیکن تم جاؤ، دکان پر لوگ تمھارے منتظر ہوں گے۔ مگر ایشور کے لیے ایک دو نہ بجا دینا۔ لڑکے سو جاتے ہیں، مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، طبیعت گھبراتی ہے۔''

سیٹھ جی نے لہجے میں محبت کی چاشنی دے کر کہا: ''بارہ بجے تک آ جاؤں گا، ضرور!''

لیلا کا چہرہ اتر گیا: ''دس بجے نہیں آ سکتے؟''

''ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے کسی طرح نہیں۔''

''ساڑھے دس بجے بھی نہیں؟''

''اچھا گیارہ بجے۔''

گیارہ پر مصالحت ہوگئی۔ لالہ جی وعدہ کر کے چلے گئے۔ لیکن شام کو ایک دوست نے مجرا سننے کی دعوت دی۔ اب بچارے اس دعوت کو کیسے رد کرتے۔ جب ایک آدمی آپ کو خاطر سے بلاتا ہے تو یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ آپ اس کی دعوت نامنظور کر دیں۔ وہ آپ سے کچھ مانگتا نہیں، آپ سے کسی طرح کی رعایت کا خواستگار نہیں، محض دوستانہ بے تکلفی سے آپ کو اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ آپ پر اس کی دعوت قبول کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ گھر کے جنجال سے کسے فرصت ہے۔ ایک نہ ایک کام تو روز لگا ہی رہتا ہے۔ کبھی کوئی بیمار ہے، کبھی مہمان آئے ہیں، کبھی پوجا ہے، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ اگر آدمی یہ سوچے کہ گھر سے بے فکر ہو کر جائیں گے تو اسے سارے دوستانہ مراسم منقطع کر لینے پڑیں گے۔ اسے شاید ہی گھر سے کبھی فراغت نصیب ہو۔ لالہ جی مجرا سننے چلے گئے تو دو بجے لوٹے۔ آتے ہی اپنے گھر کی گھڑی کی سوئیاں پیچھے کر دیں۔ لیکن ایک گھنٹہ سے زیادہ کی گنجایش کسی طرح نہ نکال سکے۔ دو کو ایک تو کہہ سکتے ہیں۔ گھڑی کی تیزی کے سر الزام رکھا جاتا ہے لیکن دو کو بارہ نہیں کہہ سکتے۔ چپکے سے آ کر نوکر کو جگایا، کھانا کھا کر آئے تھے۔ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ لیلا ان کی راہ دیکھتی، ہر لمحہ درد اور بے چینی کی بڑھتی ہوئی شدت کا احساس کرتی نہ جانے کب سو گئی تھی اسے جگانا سوئے فتنہ کو جگانا تھا۔

غریب لیلا اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکی۔ لالہ جی کو اس کی وفات کا بے حد روحانی صدمہ ہوا۔ دوستوں نے تعزیت کے تار بھیجے۔ کئی دن تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ایک روزانہ اخبار نے مرنے والے کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اس کی دماغی اور اخلاقی خوبیوں کی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی۔ لالہ جی نے ان سب ہمدردوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان کے خلوص و وفاداری کا اظہار جنت نصیب لیلا کے نام سے لڑکیوں کے لیے پانچ وظیفے قائم کرنے کی صورت میں نمودار ہوا۔ وہ نہیں مریں صاحب میں مر گیا۔ زندگی کی شمع ہدایت گل ہوگئی۔ اب تو جینا اور رونا ہے۔ میں تو ایک حقیر انسان تھا، نہ جانے کس کارِ خیر کے صلے میں مجھے یہ نعمت بارگاہِ ایزدی سے عطا ہوئی تھی۔ میں تو اس کی پرستش کرنے کے قابل بھی نہ تھا وغیرہ۔

چھ مہینے کی عزلت اور نفس کشی کے بعد لالہ ڈنگامل نے دوستوں کے اصرار سے دوسری شادی کر لی۔ آخر غریب کیا کرتے۔ زندگی میں ایک رفیق کی ضرورت تو تھی ہی اور اس عمر میں رفیق کی ضرورت اور زیادہ ہوگئی تھی۔ لکڑی کی ضرورت تو جبھی ہوتی ہے جب پانو میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہتی۔

(۲)

جب سے نئی بیوی آئی ہے لالہ جی کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب ہو گیا ہے۔ دکان سے اب انھیں اس قدر انہماک نہیں ہے۔ متواتر ہفتوں نہ جانے سے بھی ان کے کاروبار میں کوئی ہرج واقع نہ ہوتا۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت جو اُن میں روز بروز مضمحل ہوتی جاتی تھی اب یہ ترشح پا کر پھر سرسبز ہو گئی ہے۔ اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔ موٹر نیا آ گیا ہے، کمرے نئے فرنیچر سے آراستہ کر دیے گئے ہیں۔ نوکروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہو گیا ہے۔ ریڈیو بھی لگا دیا گیا ہے۔ لالہ جی کی بوڑھی جوانی، جوانوں سے زیادہ پُر جوش اور ولولہ انگیز ہو رہی ہے۔ اسی طرح جیسے بجلی کی روشنی چاند کی روشنی سے زیادہ شفاف اور نظر فریب ہوتی ہے۔ لالہ جی کو ان کے احباب ان کی اس جواں طبعی پر مبارک باد دیتے ہیں تو وہ تفاخر کے انداز سے کہتے ہیں: ''بھئی ہم تو ہمیشہ جوان رہے اور ہمیشہ جوان رہیں گے۔ بڑھاپا میرے پاس آئے تو اس کے منہ پر سیاہی لگا کر گدھے پر الٹا سوار کر کے شہر بدر کر دوں۔ جوانی اور بڑھاپے کو لوگ نہ جانے عمر سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔ جوانی کا عمر سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا مذہب کا اخلاق سے، روپے کا ایمان داری سے، حسن کا آرائش سے۔ آج کل کے جوانوں کو آپ جوان کہتے ہیں، ارے صاحب! میں ان کی ایک ہزار جوانیوں کو اپنی جوانی کے ایک گھنٹہ سے نہ تبدیل کروں۔ معلوم ہوتا ہے زندگی میں کوئی دل چسپی ہی نہیں، کوئی شوق ہی نہیں، زندگی کیا ہے گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہے۔'' یہی الفاظ وہ کچھ ضروری ترمیم کے بعد آشا دیوی کے لوحِ دل پر نقش کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ہمیشہ سنیما، تھیٹر، سیر دریا کے لیے اصرار کرتے رہتے ہیں، لیکن آشا نہ جانے کیوں ان دلچسپیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں۔ وہ جاتی تو ہے مگر بہت اصرار کے بعد۔

ایک دن لالہ جی نے آ کر کہا: ''چلو آج بجرے پر دریا کی سیر کر آئیں۔''

بارش کے دن تھے، دریا چڑھا ہوا تھا۔ ابر کی قطاریں بین الاقوامی فوجوں کی سی رنگ برنگ وردیاں پہنے آسمان پر قواعد کر رہی تھیں۔ سڑک پر لوگ ملار اور بارہ ماسے گاتے چلے جا رہے تھے۔ باغوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔

آشا نے بے دلی سے کہا: ''میرا تو جی نہیں چاہتا۔''

لالہ جی نے تادیب آمیز اصرار سے کہا: ''تمھاری کیسی طبیعت ہے جو سیر و تفریح کی جانب مائل نہیں ہوتی۔''

''آپ جائیں، مجھے اور کئی کام کرنے ہیں۔''

''کام کرنے کو ایشور نے آدمی دے دیے ہیں۔ تمھیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''مہراج اچھا سالن نہیں پکاتا۔ آپ کھانے بیٹھیں گے تو یوں ہی اُٹھ جائیں گے۔''

آشا اپنی فرصت کا بیشتر حصہ لالہ جی کے لیے انواع اقسام کے کھانے پکانے میں صرف کرتی تھی۔ کسی سے سن رکھا تھا کہ ایک خاص عمر کے بعد مردوں کی زندگی کی خاص دلچسپی لذتِ زبان رہ جاتی ہے۔ لالہ جی کے دل کی کلی کھل گئی۔ آشا کو ان سے کس قدر محبت ہے کہ وہ سیر کو ان کی خدمت پر قربان کر رہی ہے۔ ایک لیلا تھی کہ کہیں جاؤں پیچھے چلنے کو تیار، پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہانے کرنے پڑتے تھے۔ خواہ مخواہ سر پر سوار ہو جاتی تھی اور سارا مزہ کرکرا کر دیتی تھی۔

بولے: ''تمھاری بھی عجیب طبیعت ہے۔ اگر ایک دن سالن بے مزہ ہی رہا تو ایسا کیا طوفان آجائے گا! تم اس طرح میرے رئیسانہ چونچلوں کا لحاظ کرتی رہو گی تو مجھے بالکل آرام طلب بنا دو گی۔ اگر تم نہ چلو گی تو میں بھی نہ جاؤں گا۔''

آشا نے جیسے گلے سے پھندا چھڑاتے ہوئے کہا: ''آپ بھی تو مجھے ادھر ادھر گھما کر میرا مزاج بگاڑے دیتے ہیں۔ یہ عادت پڑ جائے گی تو گھر کے دھندے کون کرے گا؟''

لالہ جی نے فیاضانہ لہجے میں کہا: ''مجھے گھر کے دھندوں کی ذرّہ برابر پروا نہیں ہے، بال کی نوک برابر بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھارا مزاج نہ بگڑے اور تم اس گھر کی چکی سے دور رہو۔ اور تم مجھے بار بار آپ کیوں کہتی ہو؟ میں چاہتا ہوں تم مجھے ''تم'' کہو، ''تو'' کہو۔ محبت کی گالیاں دو، غصے کی صلواتیں سناؤ، لیکن تم مجھے ''آپ'' کہہ کر جیسے دیوتا کے سنگھاسن پر بیٹھا دیتی ہو۔ میں اپنے گھر میں دیوتا نہیں، شریر چھوکرا بن کر رہنا چاہتا ہوں۔''

آشا نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا: ''اے نوج! بھلا میں آپ کو ''تم'' کہوں گی، تم برابر والوں کو کہا جاتا ہے یا بڑوں کو؟''

منیم جی نے ایک لاکھ کے گھاٹے کی پرملال خبر سنائی ہوتی تب بھی لالہ جی کو شاید اتنا صدمہ نہ ہوتا، جتنا آشا کے ان بھولے بھولے الفاظ سے ہوا۔ ان کا سارا جوش، سارا ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا جیسے برف کی طرح منجمد ہو گیا۔ سر پر بانکی رکھی ہوئی رنگین پھول دار ٹوپی، گلے میں پڑی ہوئی جوگئے رنگ کی ریشمی چادر، وہ تن زیب کا بیل دار کرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے، یہ سارا ٹھاٹ جیسے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا، جیسے سارا نشہ کسی منتر سے اتر گیا ہو۔

دل شکستہ ہو کر بولے: ''تو تمھیں چلنا ہے یا نہیں؟''

''میرا جی نہیں چاہتا۔''

''تو میں بھی نہ جاؤں؟''

''میں آپ کو کب منع کرتی ہوں۔''

''پھر آپ کہا!''

آشا نے جیسے اندر سے زور لگا کر کہا: ''تم'' اور اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

''ہاں، اسی طرح ''تم'' کہا کرو۔ تو تم نہیں چل رہی ہو؟ اگر میں کہوں کہ تمھیں چلنا پڑے گا، تب؟''

''تب چلوں گی۔ آپ کے حکم کی پابندی میرا فرض ہے!''

لالہ جی حکم نہ دے سکے فرض اور حکم جیسے الفاظ سے ان کے کانوں میں خراش سی ہونے لگی۔ کھسیانے ہو کر باہر چلے۔ اس وقت آشا کو ان پر رحم آ گیا۔ بولی: ''تو کب تک لوٹو گے؟''

''میں نہیں جا رہا ہوں۔''

''اچھا تو میں بھی چلتی ہوں۔''

جس طرح کوئی ضدی لڑکا رونے کے بعد اپنی مطلوبہ چیز پا کر اسے پیروں سے ٹھکرا دیتا ہے اسی طرح لالہ جی نے رونا منہ بنا کر کہا: ''تمھارا جی نہیں چاہتا تو نہ چلو۔ میں مجبور نہیں کرتا۔''

''آپ... نہیں تم برا مان جاؤ گے۔''

آشا سیر کرنے گئی لیکن امنگ سے نہیں۔ جو معمولی ساری پہنے ہوئے تھی، وہی پہنے چل کھڑی ہوئی، نہ کوئی نفیس ساری نہ کوئی مرصع زیور نہ کوئی سنگار جیسے بیوہ ہو۔

ایسی ہی باتوں سے لالہ جی دل میں جھنجھلا اٹھتے تھے۔ شادی کی تھی زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے، جھلملاتے ہوئے چراغ میں تیل ڈال کر اسے اور روشن کرنے کے لیے۔ اگر چراغ کی روشنی تیز نہ ہوئی تو تیل ڈالنے سے کیا فائدہ؟ نہ جانے اس کی طبیعت کیوں اس قدر خشک اور افسردہ ہے جیسے کوئی اُوسر کا درخت ہو، کتنا ہی پانی ڈالو اس میں ہری پتیوں کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ جڑاؤ زیوروں کے بھرے صندوق رکھے ہیں۔ کہاں کہاں سے منگوائے۔ دہلی سے کلکتے سے، فرانس سے۔ کیسی کیسی بیش قیمت ساڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک نہیں سیکڑوں، مگر صندوق میں کیڑوں کی خوراک بننے کے لیے۔ غریب خاندان کی لڑکیوں میں یہی عیب ہوتا ہے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ تنگ رہتی ہے۔ نہ کھا سکیں، نہ پہن سکیں، نہ دے سکیں، انھیں تو خزانہ بھی مل جائے تو یہی سوچتی رہیں گی کہ بھلا اسے خرچ کیسے کریں۔

دریا کی سیر تو ہوئی مگر کچھ لطف نہ آیا۔

(۳)

کئی ماہ تک آشا کی طبیعت کو ابھارنے کی ناکام کوشش کر کے لالہ جی نے سمجھ لیا کہ یہ محرّم

کی پیدائش ہے۔ لیکن پھر بھی برابر مشق جاری رکھی۔ اس بیوپار میں ایک خطیر رقم صرف کرنے کے بعد وہ اس سے زیادہ نفع اٹھانے کے تاجرانہ تقاضے کو کیسے نظر انداز کرتے۔ دلچسپی کی نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتیں۔ گراموفون اگر بگڑ گیا ہے، گاتا نہیں یا آواز صاف نہیں نکالتا تو اس کی مرمت کرانی پڑے گی۔ اسے اٹھا کر رکھ دینا یہ تو حماقت ہے۔

ادھر بوڑھا مہراج بیمار ہو کر چلا گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا سولہ سترہ سال کا لڑکا آ گیا تھا۔ کچھ عجیب مسخرا سا، بالکل اجڈ اور دہقانی۔ کوئی بات ہی نہ سمجھتا۔ اس کے پھلکے اقلیدس کی شکلوں سے بھی زیادہ مختلف الاشکال ہو جاتے۔ بیچ میں موٹے، کنارے پتلے۔ دال کبھی تو اتنی پتلی جیسے چائے اور کبھی اتنی گاڑھی جیسے دہی۔ کبھی نمک بالکل پھیکا، کبھی اتنا تیز کہ نیبو کا نمکین اچار۔ آشا سویرے ہی سے رسوئی میں پہنچ جاتی اور اس بدسلیقے مہراج کو کھانا پکانا سکھاتی: ''تم کتنے نالائق آدمی ہو جُگل؟ اتنی عمر تک تم کیا گھاس کھودتے رہے یا بھاڑ جھونکتے رہے کہ پھلکے تک نہیں بنا سکتے!''

جُگل آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا: ''بہو جی! ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ سترھواں ہی سال تو ہے۔''

آشا ہنس پڑی: ''تو کیا روٹیاں پکانا دس بیس سال میں آتا ہے؟''

''آپ ایک مہینا سکھا دیں بہو جی، پھر دیکھنا میں آپ کو کیسے پھلکے کھلاتا ہوں کہ جی خوش ہو جائے۔ جس دن مجھے پھلکے بنانے آ جائیں گے میں آپ سے کوئی انعام لوں گا۔ سالن تو اب میں کچھ کچھ پکانے لگا ہوں نا؟''

آشا حوصلہ افزا تبسم سے بولی: ''سالن نہیں، وہ پکانا آتا ہے۔ ابھی کل ہی نمک اتنا تیز تھا کہ کھایا نہ گیا۔''

''میں جب سالن بنا رہا تھا تو آپ یہاں کب تھیں؟''

''اچھا! تو جب میں یہاں بیٹھی رہوں تب تمھارا سالن لذیذ پکے گا؟''

''آپ بیٹھی رہتی ہیں تو میری عقل ٹھکانے رہتی ہے۔''

''اور میں نہیں رہتی تب؟''

''تب تو آپ کے کمرے کے دروازے پر جا بیٹھتی ہے!''

''تمھارے دادا آ جائیں گے تو تم چلے جاؤ گے؟''

'نہیں بہو جی، کسی اور کام میں لگا دیجیے گا۔ مجھے موٹر چلانا سکھوا دیجیے گا۔ نہیں نہیں، آپ ہٹ جایئے میں پتیلی اتار لوں گا۔ ایسی اچھی ساری آپ کی، کہیں داغ لگ جائے تو کیا ہو؟''

''دور ہو، پھوہڑ تو تم ہی ہو۔ کہیں پتیلی پیر پر گر پڑے تو مہینوں جھیلو گے۔''

جُگل افسردہ ہو گیا۔ نحیف چہرہ اور بھی خشک ہو گیا۔

آشا نے مسکرا کر پوچھا: ''کیوں! منہ کیوں لٹک گیا سرکار کا؟''

''آپ ڈانٹ دیتی ہیں بہو جی، تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ سیٹھ جی کتنا ہی گھڑکیں مجھے ذرا بھی صدمہ نہیں ہوتا۔ آپ کی نظر کڑی دیکھ کر جیسے میرا خون سرد ہو جاتا ہے۔''

آشا نے تشفی دی: ''میں نے تمھیں ڈانٹا نہیں۔ صرف اتنا ہی کہا کہ کہیں پتیلی تمھارے پانو پر گر پڑے تو کیا ہو؟''

''ہاتھ تو آپ کا بھی ہے۔ کہیں آپ کے ہاتھ سے ہی چھوٹ پڑے تب؟''

سیٹھ جی نے رسوئی کے دروازے پر آ کر کہا: ''آشا ذرا یہاں آنا۔ دیکھو تمھارے لیے کتنے خوش نما گملے لایا ہوں۔ تمھارے کمرے کے سامنے رکھے جائیں گے۔ تم وہاں دھوئیں دھکڑ میں کیا پریشان ہوتی ہو۔ لونڈے سے کہہ دو کہ مہراج کو بلائے، ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کرلوں گا۔ مہراج کی کمی نہیں ہے۔ آخر کب تک کوئی رعایت کرے۔ اس گدھے کو ذرا بھی تو تمیز نہ آئی۔ سنتا ہے جُگل، آج لکھ دے اپنے باپ کو۔'' چولھے پر توا رکھا ہوا تھا، آشا روٹیاں بیل رہی تھی، جُگل توے کے لیے روٹیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں بھلا وہ کیسے گملے دیکھنے جاتی؟ کہنے لگی: ''ابھی آتی ہوں، ذرا روٹی بیل رہی ہوں۔ چھوڑ دوں گی تو جُگل ٹیڑھی میڑھی بیلے گا۔''

لالہ جی نے کچھ چڑ کر کہا: ''اگر روٹیاں ٹیڑھی میڑھی بیلے گا تو نکال دیا جائے گا۔''

آشا اَن سنی کر کے بولی: ''دس پانچ دن میں سیکھ جائے گا۔ نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تم چل کر بتا دو گملے کہاں رکھے جائیں؟''

''کہتی ہوں روٹیاں بیل کر آئی جاتی ہوں۔''

''نہیں میں کہتا ہوں تم روٹیاں مت بیلو۔''

''تم خواہ مخواہ ضد کرتے ہو۔''

لالہ جی سناٹے میں آ گئے۔ آشا نے کبھی اتنی بے التفاتی سے انھیں جواب نہ دیا تھا اور یہ محض بے التفاتی نہ تھی اس میں ترشی بھی تھی۔ خفیف ہو کر چلے گئے۔ انھیں ایسا غصہ آ رہا تھا کہ ان گملوں کو توڑ کر پھینک دیں اور سارے پودوں کو چولھے میں ڈال دیں۔

جُگل نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا: ''آپ چلی جائیں بہو جی! سرکار ناراض ہوں گے۔''

''بکومت! جلدی روٹیاں سینکو، نہیں نکال دیے جاؤ گے اور آج مجھ سے روپے لے کر اپنے لیے کپڑے بنوالو۔ بھک منگوں کی سی صورت بنائے گھومتے ہو۔ اور بال کیوں اتنے بڑھا رکھے ہیں۔ تمھیں نائی بھی نہیں جڑتا؟''

''کپڑے بنوالوں تو دادا کو کیا حساب دوں گا؟''

''ارے بے وقوف! میں حساب میں نہیں دینے کو کہتی۔ مجھ سے لے جانا۔''

''آپ بنوائیں گی تو اچھے کپڑے لوں گا۔ مہین کھدر کا کرتہ، کھدر کی دھوتی، ریشمی چادر اور اچھی سی چپل۔''

آشا نے مٹھاس بھرے تبسم سے کہا: ''اور اگر اپنے دام سے بنوانا پڑے تو؟''

''تب کپڑے بنواؤں گا ہی نہیں۔''

''بڑے چالاک ہو تم۔''

''آدمی اپنے گھر پر روکھی روٹی کھا کر سو رہتا ہے لیکن دعوت میں اچھے اچھے پکوان ہی کھاتا ہے۔''

''یہ سب میں نہیں جانتی۔ ایک گاڑھے کا کرتا بنوالو، اور ایک ٹوپی۔ حجامت کے لیے دو آنے پیسے لے لو۔''

''رہنے دیجیے، میں نہیں لیتا۔ اچھے کپڑے پہن کر نکلوں گا تو آپ کی یاد آئے گی۔ سڑیل کپڑے ہوئے تو جی جلے گا۔''

''تم بڑے خود غرض ہو۔ مفت کے کپڑے لو گے اور اعلا درجے کے!''

''جب یہاں سے جانے لگوں گا تو آپ مجھے اپنی تصویر دے دیجیے گا۔''

''میری تصویر لے کر کیا کرو گے؟''

''اپنی کوٹھری میں لگا دوں گا اور دیکھا کروں گا۔ بس وہی ساڑی پہن کر کھنچوانا جو کل پہنی تھی اور وہی موتیوں والی مالا بھی ہو۔ مجھے ننگی ننگی صورت اچھی نہیں لگتی۔ آپ کے پاس تو بہت گہنے ہوں گے۔ آپ پہنتی کیوں نہیں؟''

''تو تمھیں گہنے اچھے لگتے ہیں؟''

''بہت۔''

لالہ جی نے پھر آکر خفت آمیز لہجے میں کہا: ''ابھی تک تمھاری روٹیاں نہیں پکیں۔ جُگل! اگر کل سے تم نے اپنے آپ اچھی روٹیاں نہ بنائیں تو میں تمھیں نکال دوں گا!''

آشا نے فوراً ہاتھ دھوئے اور بڑی مسرت آمیز تیزی سے لالہ جی کے ساتھ جا کر گملوں کو دیکھنے لگی۔ آج اس کے چہرے پر غیر معمولی شگفتگی نظر آ رہی تھی۔ اس کے اندازِ گفتگو میں بھی دل آویز شیرینی تھی۔ لالہ جی کی ساری خفت غائب ہو گئی۔ آج اس کی باتیں زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ بولی: ''میں ان میں سے کوئی گملا نہ جانے دوں گی۔ سب میرے کمرے کے سامنے رکھوانا۔ سب کتنے سندر پودے ہیں۔ واہ! ان کے ہندی نام بھی بتا دینا۔''

لالہ جی نے چھیڑا: ''سب لے کر کیا کروگی؟ دس پانچ پسند کرلو۔ باقی باہر باغیچے میں رکھوادوں گا۔''

''جی نہیں۔ میں ایک بھی نہیں چھوڑوں گی۔ سب یہیں رکھے جائیں گے۔''

''بڑی حریص ہو تم۔''

''حریص سہی، میں آپ کو ایک بھی نہ دوں گی۔''

''دس پانچ تو دے دو۔ اتنی محنت سے لایا ہوں۔''

''جی نہیں۔ ان میں سے ایک بھی نہ ملے گا۔''

(۴)

دوسرے دن آشا نے اپنے کو زیوروں سے خوب آراستہ کیا اور فیروزی ساڑی پہن کر نکلی تو لالہ جی کی آنکھوں میں نور آ گیا۔ اب ان کی عاشقانہ دلجوئیوں کا کچھ اثر ہو رہا ہے ضرور، ورنہ ان کے بار بار تقاضا کرنے پر، منت کرنے پر بھی اس نے کوئی زیور نہ پہنا تھا۔ کبھی کبھی موتیوں کا ہار گلے میں ڈال لیتی تھی، وہ بھی بے دلی سے۔ آج ان زیوروں سے مرصع ہو کر وہ پھولی نہیں سماتی، اتراتی جاتی ہے۔ گویا کہتی ہے دیکھو میں کتنی حسین ہوں۔ پہلے جو کلی تھی وہ آج کھل گئی ہے۔

لالہ صاحب پر گھڑوں کا نشا چڑھا ہوا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے احباب و اعزّہ آ کر اس سونے کی رانی کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں۔ دیکھیں کہ ان کی زندگی کتنی پُر لطف ہے۔ جو انواع و اقسام کے شکوک دشمنوں کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ اعتماد، رواداری اور فراست نے کتنا خلوص پیدا کر دیا ہے۔

انھوں نے تجویز کی: ''چلو کہیں سیر کر آئیں۔ بڑی مزیدار ہوا چل رہی ہے۔''

آشا اس وقت کیسے آ سکتی ہے۔ ابھی اسے رسوئی بھی جانا ہے۔ وہاں سے کہیں بارہ ایک بجے تک فرصت ملے گی۔ پھر گھر کے کام دھندے سر پر سوار ہو جائیں گے۔ اسے کہاں فرصت ہے۔ پھر کل سے اس کے کلیجے میں کچھ درد بھی ہو رہا ہے۔ رہ رہ کر درد اٹھتا ہے۔ ایسا درد کبھی نہ ہوتا تھا۔ رات نہ جانے کیوں درد ہونے لگا۔

سیٹھ جی ایک بات سوچ کر دل ہی دل میں پھول اٹھے۔ وہ گولیاں رنگ لا رہی ہیں۔ راج وید نے آخر کہا بھی تھا کہ ذرا سوچ سمجھ کر ان کا استعمال کیجیے۔ کیوں نہ ہو خاندانی وید ہے۔ اس کا باپ مہاراجا بنارس کا معالج تھا۔ پرانے مجرّب نسخے ہیں اس کے پاس۔

چہرے پر سراسیمگی کا رنگ بھر کر پوچھا: ''تو رات ہی سے درد ہو رہا ہے۔ تم نے مجھ سے

کہا نہیں ورنہ وید جی سے کوئی دوا منگو دیتا۔''

''میں نے سمجھا تھا کہ آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا۔ مگر اب بڑھ رہا ہے۔''

''کہاں درد ہو رہا ہے؟ ذرا دیکھوں تو کچھ آماس تو نہیں ہے؟''

سیٹھ جی نے آشا کے آنچل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آشا نے شرما کر سر جھکا لیا اور بولی:

''یہی تمھاری شرارت مجھے اچھی نہیں لگتی۔ جا کر کوئی دوا لاؤ۔''

سیٹھ جی اپنی جوانمردی کا یہ ڈپلوما پا کر اس سے کہیں زیادہ محفوظ ہوئے جتنا شاید رائے بہادری کا خطاب پا کر ہوتے۔ اپنے اس کارنمایاں کی داد لیے بغیر انھیں کیسے چین ہو جاتا۔ جو لوگ ان کی شادی سے متعلق شبہ آمیز سرگوشیاں کرتے تھے انھیں زک دینے کا کتنا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ پہلے پنڈت بھولا ناتھ کے گھر پہنچے اور بادلِ دردمند بولے: ''میں تو بھئی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ کل سے ان کے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ کہتی ہیں ایسا درد پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔''

بھولا ناتھ نے کچھ زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ بولے: ''ہوا لگ گئی ہوگی، اور کیا؟''

سیٹھ جی نے ان سے اختلاف کیا: ''نہیں پنڈت جی، ہوا کا فساد نہیں ہے۔ کوئی اندرونی شکایت ہے۔ ابھی کم سن ہیں نا؟ راج وید سے کوئی دوا لیے لیتا ہوں۔''

''میں تو سمجھتا ہوں آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا۔''

''آپ بات نہیں سمجھتے، یہی آپ میں نقص ہے۔''

''آپ کا جو خیال ہے وہ بالکل غلط ہے۔ مگر خیر دوا لا کر دیجیے اور اپنے لیے بھی کوئی دوا لیتے آیئے گا۔''

سیٹھ یہاں سے اٹھ کر اپنے دوست لالہ بھاگ مل کے پاس پہنچے اور ان سے بھی قریب قریب انھیں الفاظ میں پرملال خبر کہی۔ بھاگ مل بڑا شہدہ تھا۔ مسکرا کر بولا: ''مجھے تو آپ کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔''

سیٹھ جی کی باچھیں کھل گئیں: ''میں اپنا دُکھ سنا رہا ہوں اور تمھیں مذاق سوجھتا ہے۔ ذرا بھی انسانیت تم میں نہیں ہے۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ بھلا اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ وہ ہیں کم سن، نازک اندام، آپ ٹھہرے آزمودہ کار، مردِ میدان۔ بس اگر یہ بات نہ نکلے تو مونچھیں منڈوا ڈالوں۔''

سیٹھ جی نے متین صورت بنائی: ''میں تو بھئی بڑی احتیاط کرتا ہوں، تمھارے سر کی قسم!''

''جی رہنے دیجیے۔ میرے سر کی قسم نہ کھایئے۔ میرے بھی بال بچے ہیں۔ گھر کا اکیلا آدمی ہوں۔ کسی قاطع دوا کا استعمال کیجیے۔''

''انھیں راج وید سے کوئی دوا لیے لیتا ہوں۔''

''اس کی دوا وید جی کے پاس نہیں۔آپ کے پاس ہے۔''

سیٹھ جی کی آنکھوں میں نور آ گیا۔شباب کا احساس پیدا ہوا اور اس کے ساتھ چہرے پر بھی شباب کی جھلک آ گئی، سینہ جیسے کچھ فراخ ہو گیا۔ چلتے وقت ان کے پیر کچھ زیادہ مضبوطی سے زمین پر پڑنے لگے اور سر کی ٹوپی بھی خدا جانے کیوں کج ہو گئی۔ بُشرے سے ایک بانکپن کی شان برس رہی تھی۔راج وید نے مژدۂ جانفزا سنا تو بولے:''میں نے کہا تھا ذرا سوچ سمجھ کر ان گولیوں کا استعمال کیجیے گا۔آپ نے میری ہدایت پر توجہ نہ کی۔ ذرا مہینے دو مہینے ان کا استعمال کیجیے اور پرہیز کے ساتھ رہیے۔ پھر دیکھیے ان کا اعجاز۔اب گولیاں بہت کم رہی ہیں، لوٹ مچی رہتی ہے۔لیکن ان کا بنانا اتنا مشکل اور دقت طلب ہے کہ ایک بار ختم ہو جانے پر مہینوں تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں بوٹیاں ہیں۔کیلاش، نیپال اور تبت سے منگانی پڑتی ہیں اور اس کا بنانا تو آپ جانتے ہیں کتنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔آپ احتیاطاً ایک شیشی لیتے جایئے۔''

(۵)

جُگل نے آشا کو سر سے پانو تک جگمگاتے دیکھ کر کہا:''بس بہو جی! آپ اسی طرح پہنے اوڑھے رہا کریں۔آج میں آپ کو چولہے کے پاس نہ آنے دوں گا۔''

آشا نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا:''کیوں، آج یہ سختی کیوں؟ کئی دن تو تم نے منع نہیں کیا۔''

''آج کی بات دوسری ہے۔''

ذرا سنوں تو کیا بات ہے۔''

''میں ڈرتا ہوں کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔''

''نہیں نہیں کہو۔میں ناراض نہ ہوں گی۔''

''آج آپ بہت سندر لگ رہی ہیں۔''

لالہ ڈنگا مل نے سیکڑوں ہی بار آشا کے حسن و انداز کی تعریف کی تھی، مگر ان کی تعریف میں اسے تصنع کی بو آتی تھی۔وہ الفاظ ان کے منہ سے کچھ اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی ہجڑا تلوار لے کر چلے۔ جُگل کے ان الفاظ میں ایک کیفیت تھی، ایک سرور تھا، ایک ہیجان تھا، ایک اضطراب تھا۔ آشا کے سارے جسم میں رعشہ آ گیا۔آنکھوں میں جیسے نشہ چھا جائے۔

''تم مجھے نظر لگا دو گے۔اس طرح کیوں گھورتے ہو؟''

''جب یہاں سے چلا جاؤں گا تب آپ کی بہت یاد آئے گی۔''

''روٹی بنا کر تم کیا کیا کرتے ہو؟ دکھائی نہیں دیتے۔''

''سرکار رہتے ہیں، اسی لیے نہیں آتا۔ پھر اب تو مجھے جواب مل رہا ہے، دیکھیے بھگوان کہاں لے جاتے ہیں۔''

آشا کا چہرہ سرخ ہو گیا: ''کون تم کو جواب دیتا ہے؟''

''سرکار ہی تو کہتے ہیں تجھے نکال دوں گا۔''

''اپنا کام کیے جاؤ۔ کوئی نہیں نکالے گا۔ اب تو تم روٹیاں بھی اچھی بنانے لگے۔''

''سرکار ہیں بڑے گسّہ ور۔''

''دو چار دن میں ان کا مزاج ٹھیک کیے دیتی ہوں۔''

''آپ کے ساتھ چلتے ہیں تو جیسے آپ کے باپ سے لگتے ہیں۔''

''تم بڑے بدمعاش ہو۔ خبردار، زبان سنبھال کر باتیں کرو۔''

مگر خفگی کا یہ پردہ اس کے دل کا راز نہ چھپا سکا۔ وہ روشنی کی طرح اس کے اندر سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ جُگل نے اسی بے باکی سے کہا: ''میری زبان کوئی بند کر لے۔ یہاں تو سب ہی کہتے ہیں۔ میرا بیاہ کوئی پچاس سال کی بڑھیا سے کر دے تو میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں، یا خود زہر کھالوں یا اسے زہر دے کر مار ڈالوں۔ پھانسی ہی تو ہو گی۔''

آشا مصنوعی غصہ قائم نہ رکھ سکی۔ جُگل نے اس کے دل کے تاروں پر مضراب کی ایک ایسی چوٹ ماری تھی کہ اس کے بہت مضبوط کرنے پر بھی دردِ دل باہر نکل ہی آیا۔ ''قسمت بھی تو کوئی چیز ہے۔''

''ایسی قسمت جائے جہنم میں۔''

''تمھاری شادی کسی بڑھیا سے کروں گی۔ دیکھ لینا۔''

''تو میں بھی زہر کھالوں گا، دیکھ لیجیے گا۔''

''کیوں؟ بڑھیا تمھیں جوان سے زیادہ پیار کرے گی، زیادہ خدمت کرے گی، تمھیں سیدھے راستے پر رکھے گی۔''

''یہ سب ماں کا کام ہے۔ بیوی جس کام کے لیے ہے، اسی کے لیے ہے۔''

''''آخر بیوی کس کام کے لیے ہے؟''

''آپ مالک ہیں، نہیں تو بتلا دیتا، بیوی کس کام کے لیے ہے۔''

موٹر کی آواز آئی۔ نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل کھسک کر کندھے پر آ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی: ''لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے، تم ذرا آ جانا۔''

☆☆☆

گلّی ڈنڈا

ہمارے انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ گلّی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجا ہے۔ اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں۔ نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے، نہ شن گارڈ کی، نہ نیٹ کی نہ بلّے کی۔ مزے سے کسی ایک درخت کی ایک شاخ کاٹ لی، گلی بنائی اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا۔ ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے سامان بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ جب تک کم از کم ایک سو خرچ نہ کیجیے، کھلاڑیوں میں شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں گلی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکری لگے چوکھا رنگ دیتا ہے۔ لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی سب چیزوں سے ہمیں نفرت سی ہو گئی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں ہر ایک لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیلنے کی فیس لی جاتی ہے۔ کسی کو یہ نہیں سوجھتا کہ ہندستانی کھیل کھلائیں جو بغیر پیسے کوڑی کے کھیلے جاتے ہیں۔ انگریزی کھیل ان کے لیے ہیں جن کے پاس روپے ہیں۔ بیچارے غریب لڑکوں کے سر پر یہ فضول خرچیاں کیوں منڈھتے ہو۔ ٹھیک ہے گلی سے آنکھ پھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے تو کیا کرکٹ سے سر پھوٹ جانے، تلی پھٹ جانے، ٹانگ ٹوٹ جانے کا خدشہ نہیں رہتا؟ اگر ہمارے ماتھے میں گلی کا داغ لگا ہوا ہے تو ہمارے کئی ایسے دوست بھی ہیں جو بلے سے گھائل ہونے کا سرٹیفکٹ رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ مجھے گلی ڈنڈا سب کھیلوں سے زیادہ پسند ہے اور بچپن کی یادوں میں گلی ڈنڈا ہی سب سے زیادہ شیریں یاد ہے۔ وہ علی الصبح گھر سے نکل جانا، وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا اور گلی ڈنڈے بنانا، وہ جوش و خروش، وہ لگن، وہ کھلاڑیوں کے جمگھٹے، وہ پدانا اور پدنا، وہ لڑائی، جھگڑے، وہ بے تکلف سادگی جس میں چھوت چھات اور غریب و امیر کی کوئی تمیز نہ تھی، جس میں امیرانہ چونچلوں کا غرور اور خودنمائی کی گنجایش ہی نہ تھی، اسی وقت بھولے گا... جب گھر والے بگڑ رہے ہیں، والد صاحب چوکے پر بیٹھے روٹیوں پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں، اماں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے لیکن ان کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے اور میں ہوں کہ پدانے میں مست ہوں۔ نہ نہانے کا خیال ہے، نہ کھانے کا۔ گلی ہے تو ذرا سی مگر اس میں دنیا بھر کی مٹھائیوں کی مٹھاس اور

تماشوں کا لطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہم جولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا۔ دُبلا، لمبا، بندروں کی سی پھرتی، بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں، بندروں کی سی جھپٹ۔ گلی کیسی ہو اس پر اس طرح لپکتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا۔ پر تھا ہمارے گلی کلب کا چمپئن۔ جس کی طرف وہ آجائے اس کی جیت یقینی تھی۔ ہم سب اسے دور سے آتا دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے اور اسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دو ہی کھیل رہے تھے۔ وہ پِدا رہا تھا، میں پِد رہا تھا لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں، پِدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لیے وہ سب چالیں چلیں جو ایسے مواقع پر خلافِ قانون ہوتے ہوئے بھی قابلِ معافی ہیں، لیکن گیا اپنا دانو لیے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا۔ منت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا، اور ڈنڈا تان کر بولا: ''میرا دانو دے کر جاؤ۔ پِدایا تو بہادر بن کر۔ پِدنے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟''

''تم دن بھر پِداؤ تو میں دن بھر پِدتا رہوں؟''

''ہاں تمھیں دن بھر پِدنا پڑے گا؟''

''نہ کھانے جاؤں نہ پینے جاؤں؟''

''ہاں میرا دانو دیے بغیر کہیں نہیں جا سکتے۔''

''میں تمھارا غلام ہوں؟''

''ہاں تم میرے غلام ہو۔''

''میں گھر جاتا ہوں۔ دیکھوں تم میرا کیا کر لیتے ہو؟''

''گھر کیسے جاؤ گے؟ کوئی دل لگی ہے۔ دانو دیا ہے۔ دانو لیں گے۔''

''اچھا کل میں نے تمھیں امرود کھلایا تھا، وہ رکھ دو۔''

''وہ پیٹ میں چلا گیا۔''

''نکالو پیٹ سے۔ تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟''

''امرود تم نے دیا، تب میں نے کھایا۔ میں تم سے مانگنے نہ گیا تھا۔''

''جب تک میرا امرود نہ دو گے میں دانو نہ دوں گا۔''

میں سمجھتا تھا انصاف میری طرف ہے۔ آخر میں نے کسی غرض کے لیے ہی اسے امرود کھلایا ہوگا۔ کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے۔ بھیک تک تو غرض کے لیے ہی دیتے ہیں۔ جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اسے مجھ سے دانو لینے کا کیا حق حاصل ہے۔ رشوت دے کر

تو لوگ خون چھپا جاتے ہیں۔ وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائے گا۔ امرود پیسے کے پانچ والے تھے جو گیا کے باپ کو کبھی نصیب نہ ہوں گے۔ یہ سراسر بے انصافی ہے۔

گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: ''میرا دانو دے کر جاؤ۔ امرود سمردو میں نہیں جانتا۔''

مجھے انصاف کا زور تھا۔ میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔

میں نے گالی دی۔ اس نے اس سے بھی سخت گالی دی اور گالی ہی نہیں دی ایک چانٹا جما دیا۔ میں نے اسے دانت سے کاٹ لیا۔ اس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا۔ میں رونے لگا۔ گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا، بھاگا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا اور ہنستا ہوا گھر پہنچا۔ میں تھانے دار کا لڑکا ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا۔ یہ مجھے اس وقت بھی بے عزتی کا باعث معلوم ہوا۔ لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہیں کی۔

ان ہی دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہم جولیوں سے جدا ہونے کا بالکل افسوس نہ ہوا۔ والد صاحب افسوس کرتے تھے۔ یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی۔ اماں جی بھی بہت افسوس کرتی تھیں۔ یہاں پر سب چیزیں سستی تھیں اور محلے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ لیکن میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ لڑکوں سے شیخی بگھارتا تھا۔ وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہیں، ایسے ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ وہاں کے انگریزی اسکول میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے۔ میرے دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہ میں کتنا اونچا اٹھ گیا ہوں۔ بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم، جو سچ کو جھوٹ بنا دیتے ہیں، نہیں سمجھ سکتے۔ دوست کہہ رہے تھے: ''تم خوش قسمت ہو۔ بھائی جاؤ۔ ہمیں تو اسی گانو میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی۔''

بیس سال گزر گئے۔ میں نے انجینئری پاس کی اور کسی ضلع کا دورہ کرتا ہوا اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی اس قدر دل کش اور شیریں یاد تازہ ہوا ٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی اور قصبے کی سیر کو نکلا۔ آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں۔ لیکن اس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہ ملا۔ جہاں کھنڈر تھے وہاں پکے مکانات کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا پرانا درخت تھا، وہاں اب ایک خوب صورت باغیچہ تھا۔ اس جگہ کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اگر اس کے نام و نشان کا علم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا۔ وہ پرانی یادگاریں باہیں پھیلا پھیلا کر اپنے پرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں۔ مگر وہ دنیا بدل گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر روؤں اور کہوں: ''تم مجھے بھول گئیں، لیکن میرے دل میں تمھاری یاد تازہ ہے۔''

اچانک ایک کھلی جگہ میں نے دو تین لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے

میں اپنے آپ کو بالکل بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں، صاحبی ٹھاٹ میں، رعب اور اختیار کے لباس میں۔ جا کر ایک لڑکے سے پوچھا: ''کیوں بیٹے! یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟''

ایک لڑکے نے گلی ڈنڈا سمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا: ''کون گیا؟ گیا چمار؟''

میں نے یوں ہی کہا: ''ہاں ہاں وہی۔ گیا نام کا کوئی آدمی ہے تو شاید وہی ہو۔''

''ہاں ہے تو۔''

''ذرا اسے بلا سکتے ہو؟''

لڑکا دوڑا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لیے آتا دکھائی دیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ اس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اس کے گلے لپٹ جاؤں، مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا: ''کہو مجھے پہنچانتے ہو؟''

گیا نے جھک کر سلام کیا: ''ہاں مالک! بھلا پہچانوں گا نہیں۔ آپ مزے میں رہے۔''

''بہت مزے میں۔ تم اپنی کہو۔''

''ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں۔''

''مانا، موہن، درگا یہ سب کہاں ہیں۔ کچھ خبر ہے؟''

''مانا تو مر گیا۔ موہن اور درگا دونوں ڈاکیے ہو گئے ہیں۔ آپ؟''

''میں ضلع کا انجینئر ہوں۔''

''سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین تھے۔''

''اب کبھی گلی ڈنڈا کھیلتے ہو؟''

گیا نے میری طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا۔ ''گلی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار۔ اب تو پیٹ کے دھندے سے ہی چھٹی نہیں ملتی۔''

''آؤ آج ہم تم کھیلیں۔ تم پدانا ہم پدیں گے۔ تمھارا ایک دانو ہمارے اوپر ہے، وہ آج لے لو۔''

گیا بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ وہ ٹھہرا ٹکے کا مزدور، میں ایک بڑا افسر۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ۔ بیچارہ جھینپ رہا تھا لیکن مجھے بھی کم جھینپ نہ تھی۔ اس لیے نہیں کہ میں گیا سے کھیلنے جا رہا تھا بلکہ لوگ اس کھیل کو عجوبہ سمجھ کر اس کا تماشا بنا لیں گے اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی۔ اس بھیڑ میں وہ لطف کہاں رہے گا، لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں بستی سے بہت دور تنہائی میں جا کر کھیلیں۔ وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہوگا۔ مزے سے کھیلیں گے اور بچپن کی اس مٹھائی کو خوب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا۔ اور موٹر میں بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے۔ ساتھ ایک کلہاڑی لے لی۔ میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ

کرر ہا تھا۔ مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہ تھا۔ شاید ہم دونوں میں جو فرق ہو گیا تھا وہ اسے سوچنے میں محو تھا۔

میں نے پوچھا: ''تمھیں کبھی ہماری یاد آتی تھی گیا؟ سچ کہنا!''

گیا جھینپتا ہوا بولا: ''میں آپ کو کیا یاد کرتا حضور، کس لائق ہوں۔ قسمت میں کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا۔ نہیں تو میری کیا گنتی۔''

میں نے کچھ اداس ہو کر کہا: ''لیکن مجھے تو تمھاری یاد برابر آتی تھی۔ تمھارا وہ ڈنڈا جو تم نے تان کر جمایا تھا، یاد ہے نا۔''

گیا نے شرماتے ہوئے کہا: ''وہ لڑکپن تھا سرکار، اس کی یاد نہ دلاؤ۔''

''واہ، وہ میرے ان دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے۔ تمھارے اس ڈنڈے میں جو رس تھا وہ اب عزت اور بڑائی میں پاتا ہوں نہ دولت میں۔ کچھ ایسی مٹھاس تھی اس میں کہ آج تک اس سے من میٹھا ہوتا رہتا ہے۔''

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا جہاں آ کر کسی وقت ہم کنول کے پھول توڑنے جاتے تھے اور اس کے جھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آ رہی ہے۔ میں لپک کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ کاٹ لایا جھٹ پٹ گلی ڈنڈا بن گیا۔ کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے راب میں گلی رکھ کر اچھالی، گیا کے سامنے سے نکل گئی۔ اس نے ہاتھ لپکایا جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو۔ گلی اس کے پیچھے جا گری۔ یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلی جیسے آپ ہی آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ اپنے دائیں بائیں کہیں ہو، گلی اس کی ہتھیلی میں ہی پہنچتی تھی جیسے گلیوں پر اس نے جادو کر کے انھیں بس میں کر لیا ہو۔ نئی گلی، پرانی گلی، چھوٹی گلی، بڑی گلی، نوک دار گلی سب ہی اس سے ہل جاتی تھیں۔ گویا اس کے ہاتھوں میں کوئی مقناطیسی طاقت ہے جو گلیوں کو کھینچ لیتی ہو۔ لیکن آج گلی کو اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ پھر تو میں نے پدانا شروع کیا۔ میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا۔ مشق کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا۔ دانو پورا ہونے پر بھی میں کھیلے جاتا تھا حالاں کہ قاعدے کے مطابق گیا کی باری آنی چاہیے تھی۔ گلی پر ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا ہی دور پر گر پڑتی تو میں لپک کر اسے خود ہی اٹھا لاتا اور دوبارہ مل لگاتا۔ گیا یہ ساری بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا، مگر نہ بولتا تھا، گویا اسے وہ تمام قاعدے قانون بھول گئے ہوں۔ اس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا۔ گلی اس کے ہاتھ سے نکل کر ٹن سے ڈنڈے میں آ کر لگتی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کا کام تھا ڈنڈے سے ٹکرا جانا۔ لیکن آج وہ گلی ڈنڈے میں لگتی ہی نہیں۔ کبھی داہنے جاتی ہے کبھی بائیں۔ کبھی آگے کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹہ پدانے کے بعد ایک بار گلی ڈنڈے میں آ لگی۔ میں نے دھاندلی کی: ''گلی ڈنڈے میں نہیں لگی۔ پاس سے گئی۔ لیکن لگی نہیں۔''

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا: ''نہ لگی ہوگی۔''

''ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا!''

''نہیں بھیا، تم بھلا بے ایمانی کرو گے!''

بچپن میں مجال تھی کہ میں ایسا گھپلا کر کے جیتا بچتا۔ یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا۔ لیکن آج میں اسے کتنی آسانی سے دھوکا دیے چلا جاتا تھا۔ ''گدھا ہے۔ ساری باتیں بھول گیا۔''

اچانک گلی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو۔ اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کا فریب چلنے کا مجھے اس وقت حوصلہ نہ ہوسکا۔ لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں، میرا ہرج ہی کیا ہے۔ مان گیا واہ وا، ورنہ دو چار ہاتھ پدنا ہی تو پڑے گا۔ اندھیرے کا بہانہ کر کے گلا چھڑا لوں گا۔ پھر کون دانو دینے آتا ہے۔

گیا نے فاتحانہ انداز سے کہا: ''لگ گئی، لگ گئی۔ ٹن سے بولی۔''

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''تم نے لگتے دیکھا، میں نے تو نہیں دیکھا۔''

''ٹن سے بولی ہے سرکار!''

''اور جو کسی اینٹ میں لگ گئی ہو؟''

میرے منہ سے یہ فقرہ اس وقت کیسے نکل گیا اس پر مجھے خود حیرت ہے۔ اس سچائی کا جھٹلانا ایسا ہی تھا جیسے دن کو رات بتانا۔ ہم دونوں نے گلی ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا۔ لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

ہاں سرکار کسی اینٹ سے لگی ہوگی۔ ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی۔''

میں نے پھر پدانا شروع کیا، لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا۔ اس لیے جب تیسری بار گلی ڈنڈے میں لگی تو میں نے بڑی فراخ دلی سے دانو دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا: ''اب تو اندھیرا ہو گیا ہے بھیا۔ کل پر رکھو۔''

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہوگا۔ یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے۔ اس لیے اسی وقت معاملہ صاف کر لینا اچھا ہوگا۔ ''نہیں نہیں، ابھی بہت اجالا ہے۔ تم اپنا دانو لے لو۔''

''گلی سوجھے گی نہیں۔''

''کچھ پروا نہیں۔''

گیا نے پدانا شروع کیا۔لیکن اب اسے بالکل مشق نہ تھی۔اس نے دو بار ٹل لگانے کا ارادہ کیا لیکن دونوں ہی بار چوک گیا۔ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا دانو پورا کر چکا۔بیچارہ گھنٹہ بھر پدا لیکن ایک منٹ میں ہی اپنا دانو کھو بیٹھا۔میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا۔''ایک دانو اور لے لو۔تم تو پہلے ہی ہاتھ میں ہیچ گئے۔''

''نہیں بھیا،اب اندھیرا ہو گیا ہے۔''

''تمھاری مشق چھوٹ گئی۔کیا کبھی کھیلتے نہیں ہو؟''

''کھیلنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے بھیا۔''

ہم دونوں موٹر پر جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر پہنچ گئے۔

گیا چلتے چلتے بولا:''کل یہاں گلی ڈنڈا ہوگی۔سب ہی پرانے کھلاڑی کھیلیں گے۔تم بھی آؤ گے؟ جب تمھیں فرصت ہو سب کھلاڑیوں کو بلالوں۔''

میں نے شام کا وقت دیا اور دوسرے دن میچ دیکھنے گیا۔کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے۔مگر بیشتر نوجوان تھے،جنھیں میں پہچان نہ سکا۔کھیل شروع ہوا۔میں موٹر میں بیٹھا تماشا دیکھنے لگا۔آج گیا کا کھیل اور اس کی کرامات دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔وہ ٹل لگاتا تو گلی آسمان سے باتیں کرتی۔کل کی سی وہ جھجک،وہ ہچکچاہٹ،وہ بے دلی آج نہ تھی۔لڑکپن کی جو بات تھی آج اس نے اسے کمال معراج تک پہنچا دیا۔کہیں کل اس نے مجھے اس طرح پدایا ہوتا تو میں ضرور رونے لگتا۔اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدانے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بے عنوانی کی۔اس کا دعوا تھا کہ میں نے گلی دبوچ لی ہے۔گیا کا کہنا تھا گلی زمین سے لگ کر اچھلی ہے۔اس پر دونوں میں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی۔نوجوان دب گیا۔گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔میں کھیل میں نہ تھا،مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آرہا تھا جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے۔اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا کل میرے ساتھ کھیلا نہیں صرف کھیلنے کا بہانہ کیا۔اس نے مجھے قابلِ رحم سمجھا۔میں نے دھاندلی کی،بے ایمانیاں کیں،اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا،اس لیے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا مجھے کھلا رہا تھا۔میرا جی رکھ رہا تھا۔وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔میں اب افسر ہوں۔یہ افسری میرے اور اس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے۔میں اب اس کا لحاظ پا سکتا ہوں،ادب پا سکتا ہوں،لیکن اس کا ہم جولی نہیں بن سکتا۔لڑکپن تھا تب میں اس کا ساتھی تھا۔ہم میں کوئی بھید نہ تھا۔یہ عہدہ پا کر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں۔وہ اب مجھے اپنا جوڑ نہیں سمجھتا۔وہ بڑا ہو گیا ہے۔میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

☆☆☆

سَوانگ

(۱)

راجپوت خاندان میں پیدا ہو جانے ہی سے کوئی سورما نہیں بن جاتا اور نہ نام کے پیچھے سنگھ کی دُم لگا لینے ہی سے بہادری آتی ہے۔ گجندر سنگھ کے بزرگ کسی زمانے میں راجپوت تھے۔ اس میں شبہ کی گنجایش نہیں لیکن ادھر تین پشتوں سے تو نام کے سوا اِن میں راجپوتی کی کوئی علامت نہ تھی۔ گجندر سنگھ کے جدِ بزرگوار وکیل تھے اور جرح یا بحث میں کبھی کبھی راجپوتی کا مظاہرہ کر جاتے تھے۔ پدر بزرگوار نے کپڑے کی دکان کھول کر اس مظاہرے کی بھی گنجایش نہ رکھی اور گجندر نے تو لٹیا ہی ڈبودی۔ قد و قامت میں بھی فرق آتا گیا۔ بھوپندر سنگھ کا سینہ فراخ تھا۔ نریندر سنگھ کا شکم فراخ تھا لیکن گجندر سنگھ کا کچھ بھی فراخ نہ تھا۔ وہ ہلکے پھلکے، گورے چٹے، عینک باز، نازک بدن، فیشن ایبل بابو تھے۔ انھیں علمی مشاغل سے دلچسپی تھی۔

مگر راجپوت کیسا ہی ہو، اس کی شادی تو راجپوت خاندان ہی میں ہوگی۔ گجندر سنگھ کی شادی جس خاندان میں ہوئی تھی اس خاندان میں راجپوتی جوہر بالکل فنا نہیں ہوا تھا۔ ان کے خسر پنشنر صوبے دار تھے۔ سالے شکاری اور کشتی باز۔ شادی ہوئے دو سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ایک بار بھی سسرال نہ آ سکا تھا۔ امتحانات سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ لیکن اب تعلیم ختم ہو چکی تھی۔ ملازمت کی تلاش تھی۔ اس لیے اب کی ہولی کے موقع پر سسرال سے بلاوا آیا تو اس نے کوئی حیل وحجت نہ کی۔ صوبے دار کی بڑے بڑے افسروں سے شناسائی تھی۔ فوجی افسروں کی حکام کتنی قدر و منزلت کرتے ہیں، یہ اسے خوب معلوم تھا۔ سمجھا ممکن ہے صوبے دار صاحب کی سفارش سے نائب تحصیل داری میں نامزد ہو جاؤں۔ ادھر شیام دلاری سے بھی سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک نشانے سے دو شکار ہو رہے تھے۔ نیا ریشمی کوٹ بنوایا اور ہولی کے ایک دن پہلے سسرال جا پہنچا۔ اپنے گرانڈیل سالوں کے سامنے بچہ سا معلوم ہوتا تھا۔

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ گجندر سنگھ اپنے سالوں سے زمانۂ طالب علمی کے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ فٹ بال میں کس طرح ایک دیو قامت گورے کو پٹخنی دی۔ ہاکی میچ میں کس طرح تنہا

گول کرلیا کہ صوبے دار صاحب دیو کی طرح آ کر کھڑے ہو گئے اور بڑے لڑکے سے بولے:
''ارے سنو! تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ بابو جی شہر سے آئے ہیں۔ انھیں لے جا کر سیر کرا لاؤ۔ کچھ شکار وکار کھلاؤ۔ یہاں تھیٹر ویٹر تو ہے نہیں، ان کا جی گھبراتا ہوگا۔ وقت بھی اچھا ہے، شام تک لوٹ آؤ گے۔''

شکار کا نام سنتے ہی گجند رسنگھ کی نانی مرگئی۔ بے چارے نے عمر بھر کبھی شکار نہ کھیلا تھا۔ دیہاتی اجڈ لونڈے اسے نہ جانے کہاں کہاں دوڑائیں گے۔ کہیں کسی جانور کا سامنا ہو گیا تو کہیں کے نہ رہے۔ کون جانے ہرن ہی چوٹ کر بیٹھے۔ ہرن بھی راہِ فرار نہ پا کر کبھی پلٹ پڑتا ہے۔ کہیں بھیڑیا نکل آئے تو کام ہی تمام کر دے۔

بولے: ''میرا تو اس وقت شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہت تھک گیا ہوں۔''

صوبے دار صاحب نے فرمایا: ''تم گھوڑے پر سوار ہو لینا۔ یہی تو دیہات کی بہار ہے۔ چنو جا کر بندوق لا۔ میں بھی چلوں گا۔ کئی دن سے باہر نکلا نہیں۔ میری رائفل بھی لیتے آنا۔''

چنو اور منو خوش خوش بندوق لینے دوڑے۔ ادھر گجند رسنگھ کی جان سوکھنے لگی۔ پچھتا رہا تھا کہ ناحق ان لونڈوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔ جانتا کہ یہ بلا سر پر آنے والی ہے تو آتے ہی فوراً بیمار بن کر چارپائی پر پڑا رہتا۔ اب تو کوئی حیلہ بھی نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی مصیبت گھوڑے کی سواری تھی۔ دیہاتی گھوڑے یوں ہی تھان پر بندھے بندھے ٹرے ہو جاتے ہیں اور آسن کا کچا سوار دیکھ کر تو وہ اور بھی شوخیاں کرنے لگتے ہیں۔ کہیں الف ہو گیا یا مجھے لے کر کسی نالے کی طرف بے تحاشا بھاگا تو خیریت نہیں۔

دونوں سالے بندوقیں لے کر آ پہنچے۔ گھوڑا کھینچ کر آ گیا۔ صوبے دار صاحب شکاری کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ اب گجندر کے لیے کوئی حیلہ نہ رہا۔ اس نے گھوڑے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ بار بار زمین پر پیر پٹکتا تھا، ہنہناتا تھا، اٹھی ہوئی گردن، لال لال آنکھیں، کنوتیاں کھڑی، بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ گجند ر دل میں سہم اٹھا، مگر بہادری دکھانے کے لیے گھوڑے کے پاس جا کر اس کی گردن میں اس طرح تھپکیاں دیں گویا پکا شہسوار ہے اور بولا: ''جانور تو جاندار ہے، مگر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ تو پیدل چلیں اور میں گھوڑے پر بیٹھوں۔ ایسا بھی تھکا نہیں ہوں۔ میں بھی پیدل ہی چلوں گا۔ اس کی مجھے مشق ہے۔''

صوبے دار نے کہا۔ ''بیٹا! جنگل دور ہے، تھک جاؤ گے۔ بڑا سیدھا جانور ہے، بچہ بھی سوار ہو سکتا ہے۔''

گجند ر نے کہا: ''جی نہیں، مجھے یوں ہی چلنے دیجیے۔ گپ شپ کرتے ہوئے چلے چلیں

گے۔ سواری میں وہ لطف کہاں۔ آپ بزرگ ہیں سوار ہو جائیں۔''

چاروں آدمی پیادہ چلے۔ لوگوں پر گجندر کے اس انکسار کا بہت اچھا اثر ہوا۔ تہذیب اور اخلاق تو شہر والے ہی جانتے ہیں۔ اس پر علم کی برکت!

تھوڑی دیر بعد پتھریلا راستہ ملا، ایک طرف ہرا بھرا میدان، دوسری طرف پہاڑ کا سلسلہ، دونوں ہی طرف ببول، کریل، کروندے اور ڈھاک کے جنگل تھے۔ صوبے دار صاحب اپنی فوجی زندگی کے پامال قصے کہتے چلے آتے تھے۔ گجندر تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بار بار پچھڑ جاتا تھے اور اسے دو چار قدم دوڑ کر ان کے برابر ہونا پڑتا تھا۔ پسینے میں تر، ہانپتا ہوا اپنی حماقت پر پچھتاتا چلا جاتا تھا۔ ''یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ابھی سے یہ حال ہے۔ شکار نظر آیا تو نہ معلوم کیا آفت آئے گی۔ میل دو میل کی دوڑ تو ان کے لیے معمولی بات ہے، مگر یہاں تو کچومر ہی نکل جائے گا۔ شاید بے ہوش ہو کر گر پڑوں۔ پیر ابھی سے نو نو من کے ہو رہے ہیں۔''

یکا یک راستے میں سیمل کا ایک درخت نظر آیا۔ نیچے لال لال پھول بچھے ہوئے تھے، اوپر سارا درخت گلنار ہو رہا تھا۔ گجندر وہیں کھڑا ہو گیا اور اس لالہ زار کو مستانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ چنو نے پوچھا۔ ''کیا ہے جیجا جی، رک کیسے گئے؟''

گجندر نے عاشقانہ وارفتگی سے کہا: ''کچھ نہیں۔ اس درخت کا حسن دلآویز دیکھ کر دل باغ باغ ہوا جا رہا تھا۔ اہا! کیا بہار ہے، کیا مذاق ہے، کیا شان ہے گویا جنگل کی دیوی نے شفق کو شرمندہ کرنے کے لیے زعفرانی جوڑا زیب تن کیا ہو، یا رشیوں کی پاک روحیں سفر جاوداں میں یہاں آرام کر رہی ہوں، یا قدرت کا نغمہ شیریں شکل پذیر ہو کر دنیا پر موہنی منتر ڈال رہا ہو۔ آپ لوگ شکار کھیلنے چلیے مجھے اس آب حیات سے شاد کام ہونے دیجیے۔''

دونوں نوجوان فرطِ حیرت سے گجندر کا منہ تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں۔ دیہات کے رہنے والے، سیمل ان کے لیے کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ اسے روز دیکھتے تھے، کتنی بار اس پر چڑھے تھے، اس کے نیچے دوڑے تھے۔ اس کے پھولوں کی گیند بنا کر کھیلتے تھے۔ ان پر یہ مستی کبھی نہ طاری ہوئی تھی۔ حسن پرستی وہ کیا جانیں۔

صوبے دار صاحب آگے بڑھ گئے تھے۔ ان لوگوں کو ٹھہرا ہوا دیکھ کر لوٹ آئے اور بولے: ''کیوں بیٹا ٹھہر کیوں گئے۔''

گجندر نے دست بستہ گزارش کی: ''آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں شکار کھیلنے نہ جا سکوں گا۔ اس گلزار کو دیکھ کر مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی ہے میری روح نغمۂ جنت کا مزا لے رہی ہے۔ آہا یہ میرا ہی دل ہے جو پھول بن کر چمک رہا ہے۔ مجھ میں بھی وہی سرخی ہے، وہی حسن

ہے، وہی طاقت ہے، میرے دل پر صرف اگیان کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کس کا شکار کریں؟ جنگل کے معصوم جانوروں کا! ہمیں تو جانور ہیں، ہمیں تو پرند ہیں۔ یہ ہمارے ہی تصورات کا آئینہ ہے جس میں عالم اجسام کی جھلک نظر آرہی ہے۔ کیا اپنا ہی خون کریں! نہیں۔ آپ لوگ شکار کھیلنے جائیں، مجھے اس مستی و بہار میں محو ہونے دیں، بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ آپ بھی شکار سے باز آئیں۔ زندگی مسرّت کا خزانہ ہے۔ اس کا خون نہ کیجیے۔ نظارہ ہائے قدرت سے چشم باطن کو مسرور کیجیے۔ قدرت کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک پھول میں، ایک ایک ہستی میں مسرّت کی شعائیں چمک رہی ہیں۔ خوں ریزیوں سے مسرّت کے اس لازوال چشمے کو ناپاک نہ کیجیے۔''

اس تصوف آمیز تقریر نے سب ہی کو متاثر کر دیا ہے۔ صوبے دار صاحب نے چنو سے آہستہ سے کہا: ''عمر تو کچھ نہیں ہے لیکن کتنا گیان بھرا ہوا ہے۔'' چنو نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا: ''علم سے روح بیدار ہو جاتی ہے۔ شکار کھیلنا بُرا ہے۔''

صوبے دار نے عارفانہ انداز سے کہا: ''ہاں بُرا تو ہے۔ چلو لوٹ چلیں۔ جب ہر ایک چیز میں اس کا جلوہ ہے تو شکاری کون اور شکار کون۔ اب کبھی شکار نہ کھیلوں گا۔''

پھر وہ گجندر سے بولے: ''بھیا، تمھارے اُپدیش نے ہماری آنکھیں کھول دیں، قسم کھاتے ہیں اب کبھی شکار نہ کھیلیں گے۔''

گجندر پر مستانہ کیفیت طاری تھی۔ اسی سرور کے عالم میں بولے: ''ایشور کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو یہ توفیق عطا کی۔ مجھے خود شکار کا کتنا شوق تھا عرض نہیں کر سکتا۔ ان گنت جنگلی سور، تیندوے، نیل گائیں ہلاک کیے ہوں گے۔ ایک بار چیتے کو مار ڈالا تھا، مگر آج مے عرفاں کا وہ نشہ ہوا کہ ماسوا کا کہیں وجود ہی نہیں رہا۔''

(۲)

ہولی جلنے کی مہورت نو بجے رات کو تھی۔ آٹھ ہی بجے سے گانو کے عورت، مرد، بوڑھے، بچے گاتے بجاتے عبیریں اڑاتے ہولی کی طرف چلے۔ صوبے دار بھی بال بچوں کو لیے ہوئے مہمان کے ساتھ ہولی جلانے چلے۔

گجندر نے ابھی تک کسی بڑے گانو کی ہولی نہ دیکھی تھی۔ اس کے شہر میں تو ہر محلے میں لکڑی کے موٹے موٹے دو چار کندے جلا دیے جاتے تھے جو کئی کئی دن جلتے رہتے تھے۔ یہاں کی ہولی ایک وسیع میدان میں کسی کوہسار کی بلند چوٹی کی طرح آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ جوں ہی پنڈت جی نے منتر پڑھ کر نئے سال کا خیر مقدم کیا آتش بازی چھوٹنے لگی۔ چھوٹے بڑے سب ہی

پٹاخے، چھچھوندریں، ہوائیاں چھوڑنے لگے۔ گجندر کے سر پر سے کتنی چھچھوندریں سنسناتی ہوئی نکل گئیں۔ ہر ایک پٹاخے پر بیچارہ دو چار قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا اور دل میں ان اجڈ دیہاتیوں کو بددعائیں دیتا تھا۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔ بارود کہیں کپڑے میں لگ جائے، کوئی اور واردات ہو جائے تو ساری شرارت نکل جائے۔ روز ہی تو ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں، مگر ان دہقانوں کو کیا خبر۔ یہاں تو دادا نے جو کچھ کیا وہی کریں گے چاہے اس میں کچھ تُک ہو یا نہ ہو۔

دفعتاً نزدیک سے ایک بم گولے کے چھوٹنے کی فلک شگاف آواز آئی گویا بجلی کڑکی ہو۔ گجندر سنگھ چونک کر کوئی دو فٹ اونچے اچھل گئے۔ اپنی زندگی میں وہ شاید کبھی اتنا نہ کودے تھے۔ دل دھک دھک کرنے لگا گویا توپ کے نشانے کے سامنے کھڑے ہوں۔ فوراً دونوں کان انگلیوں سے بند کر لیے اور دس قدم پیچھے ہٹ گئے۔

چنو نے کہا: ''جیجا جی، آپ کیا چھوڑیں گے۔ کیا لاؤں؟''

منو بولا: ''ہوائیاں چھوڑئے جیجا جی۔ بہت اچھی ہیں۔ آسمان میں نکل جاتی ہیں۔''

چنو: ''ہوائیاں بچے چھوڑتے ہیں کہ یہ چھوڑیں گے۔ آپ بم گولا چھوڑیے بھائی صاحب۔''

گجندر: ''بھئی ان چیزوں کا شوق نہیں۔ مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ بوڑھے بھی کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔''

منو: ''دو چار ماہتابیاں تو ضرور چھوڑیے۔''

گجندر کو ماہتابیاں بے ضرر معلوم ہوئیں۔ ان کی سرخ، سبز، سنہری چمک کے سامنے ان کے گورے چہرے اور خوبصورت بالوں اور ریشمی کرتے کی دلفریبی کتنی بڑھ جائے گی۔ کوئی خطرے کی بات نہیں، مزے سے ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ گل ٹپ ٹپ نیچے گر رہا ہے اور سب کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ان کا فلسفی دماغ بھی خودنمائی کے شوق سے خالی نہ تھا۔ فوراً ماہتابی لیلی، گو ایک شان بے نیازی کے ساتھ۔ مگر پہلی ہی ماہتابی چھوڑنا شروع کی تھی کہ دوسرا بم گولہ چھوٹا۔ آسمان کانپ اٹھا۔ گجندر کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا کان کے پردے پھٹ گئے یا سر پر کوئی ہتھوڑا سا گر پڑا۔ ماہتابی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور سینے میں اختلاج ہونے لگا۔ ابھی اس دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ تیسرا دھماکہ ہوا، جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ساری فضا متلاطم ہو گئی۔ چڑیاں گھونسلوں سے نکل نکل کر شور مچاتی ہوئی بھاگیں، جانور رسیاں تڑا تڑا کر بھاگے اور گجندر بھی سر پر پانو رکھ کر بھاگے، سرپٹ اور گھر پر آ کر دم لیا۔ چنو اور منو دونوں گھبرا گئے۔ صوبے دار صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ تینوں آدمی بکٹٹ دوڑے ہوئے گجندر کے پیچھے چلے۔ دوسروں نے جو انھیں بھاگتے دیکھا تو

سمجھے کوئی شدید واردات ہوگئی۔ سب کے سب ان کے پیچھے ہو لیے۔ گانو میں ایک معزز مہمان کا آنا معمولی بات نہ تھی۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے: ''مہمان کو ہوا کیا گیا؟ ماجرا کیا ہے؟ کیوں یہ لوگ دوڑے جا رہے ہیں؟'' ایک لمحے میں سیکڑوں آدمی صوبے دار صاحب کے دروازے پر پرسشِ حال کے لیے جمع ہو گئے۔ گانو کا داماد کم رو ہونے پر بھی قابل زیارت اور بدحال ہوتے ہوئے بھی منظور نظر ہوتا ہے۔

صوبے دار نے سہمی ہوئی آواز سے کہا: ''تم وہاں سے کیوں آ گئے بھیا؟''

گجندر کو کیا معلوم تھا کہ اس کے چلے آنے سے یہ تہلکہ مچ جائے گا۔ مگر اس کے حاضر دماغ نے جواب سوچ لیا تھا اور جواب بھی ایسا کہ گانو والوں پر اس کا خداری کا سکہ بٹھا دے۔ بولا: ''کوئی خاص بات نہ تھی۔ دل میں کچھ ایسا ہی آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔''

''نہیں، کوئی بات ضرور تھی''۔

''آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ میں اسے ظاہر کر کے آپ کے جشن میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''جب تک بتلا نہ دو گے بیٹا ہمیں تسلی نہ ہوگی۔ سارا گانو گھبرایا ہوا ہے۔''

گجندر نے پھر صوفیوں کا سا چہرہ بنایا، آنکھیں بند کر لیں، جمائیاں لیں اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولے: ''بات یہ ہے کہ جوں ہی میں نے ماہتابی ہاتھ میں لی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اسے میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ میں نے کبھی آتش بازیاں نہیں چھوڑیں۔ ہمیشہ اس کی مذمّت کرتا ہوں۔ آج میں نے وہ فعل کیا جو میرے ضمیر کے خلاف تھا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری روح مجھ پر نفریں کر رہی ہے۔ شرم سے میری گردن خم ہو گئی اور میں اسی عالم میں وہاں سے بھاگا۔ اب آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں، میں آپ کے جشن میں شریک نہ ہو سکوں گا۔''

صوبے دار صاحب نے اس انداز سے گردن ہلائی گویا ان کے سوا کوئی وہاں اس تصوف کا راز نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں: ''آتی ہیں تم لوگوں کی سمجھ میں یہ باتیں، تم بھلا کیا سمجھو گے۔ ہم بھی کچھ ہی کچھ سمجھتے ہیں۔''

ہولی تو وقت معینہ پر جلائی گئی، مگر آتش بازیاں دریا میں ڈال دی گئیں۔ شریر لڑکوں نے کچھ اس لیے چھپا کر رکھ لیں کہ گجندر چلے جائیں گے تو مزے سے چھوڑیں گے۔

شیام دلاری نے تخلیے میں کہا: ''تم تو وہاں سے خوب بھاگے۔''

گجندر اکڑ کر بولے: ''بھاگتا کیوں، بھاگنے کی تو کوئی بات نہ تھی۔''

''میری تو جان نکل گئی کہ نہ معلوم کیا ہوگیا۔ تمھارے ہی ساتھ میں بھی دوڑی آئی۔ ٹوکری بھر آتش بازی پانی میں پھینک دی گئی۔''

''یہ تو روپے کو آگ میں پھونکنا ہے۔''

''ہولی میں بھی نہ چھوڑیں تو کب چھوڑیں۔ تیوہار اسی لیے تو آتے ہیں۔''

''تیوہار میں گاؤ بجاؤ، اچھی اچھی چیزیں پکاؤ، خیرات کرو، عزیزوں سے ملو، سب سے محبت سے پیش آؤ۔ بارود اُڑانے کا نام تیوہار نہیں ہے۔''

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ کسی نے دروازے پر دھکا مارا۔

گجندر نے چونک کر پوچھا: ''یہ دھکا کس نے مارا؟''

شیامانے لاپروائی سے کہا: ''بلّی وِلی ہوگی۔''

کئی آدمیوں کے کھٹ پٹ کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کواڑ پر دھکا مارا۔ گجندر کو لرزہ آ گیا۔ لالٹین لے کر دروازے سے جھانکا تو چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ چار پانچ آدمی کرتے پہنے، پگڑیاں باندھے، داڑھیاں لگائے، شانے پر بندوقیں رکھے کواڑ کو توڑ ڈالنے کی سرگرم کوشش میں مصروف تھے۔ گجندر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ ''دونوں سو گئے ہیں۔ کواڑ توڑ ڈالو۔ مال الماری میں ہے۔''

''اور اگر دونوں جاگ گئے۔''

''عورت کیا کر سکتی ہے۔ مرد کو چارپائی سے باندھ دیں گے۔''

''سنتے ہیں گجندر سنگھ کوئی بڑا پہلوان ہے۔''

''کیسا ہی پہلوان ہو۔ چار ہتھیار بند آدمیوں کے سامنے کیا کر سکتا ہے۔''

گجندر کے کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شیام دلاری سے بولے: ''یہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ میرے تو ہاتھ پانو کانپ رہے ہیں۔''

''چور چور پکارو۔ جاگ ہو جائے گی۔ آپ بھاگ جائیں گے۔ نہیں میں چلاتی ہوں، چور کا دل آدھا۔''

''نانا! کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ ان سبھوں کے پاس بندوقیں ہیں۔ گانو میں اتنا سناٹا کیوں ہے۔ گھر کے آدمی کیا ہوئے۔''

''بھیا اور منو دادا کھلیان میں سونے گئے ہیں۔ کاکا دروازے پر پڑے ہوں گے۔ ان کے کانوں پر توپ چھوٹے تب بھی نہ جاگیں گے۔''

''اس کمرے میں کوئی دوسری کھڑکی بھی تو نہیں ہے کہ باہر آواز پہنچے۔ مکان ہیں یا

قیدخانے؟''

''میں تو چلاتی ہوں۔''

''ارے نہیں بھائی۔ کیوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ میں تو سوچتا ہوں ہم دونوں چپ سادھ کر لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کرلیں۔ بدمعاشوں کو جو کچھ لے جانا ہو لے جائیں، جان تو بچے۔ دیکھو کواڑ ہل رہے ہیں۔ کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ یا ایشور کہاں جاؤں اس مصیبت میں تمھارا ہی بھروسا ہے۔ کیا جانتا تھا کہ یہ آفت آنے والی ہے۔ نہیں تو آتا ہی کیوں بس چپ ہی سادھ لو۔ اگر ہلائیں ولائیں تو بھی سانس مت لینا۔''

''مجھ سے تو چپی سادھ کر پڑا نہ رہا جائے گا۔''

''زیور اتار کر رکھ کیوں نہیں دیتیں۔ شیطان زیور ہی تو لیں گے۔''

''زیور تو نہ اتاروں گی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔''

''کیوں جان دینے پر تلی ہوئی ہو؟''

''خوشی سے تو زیور نہ اتاروں گی، زبردستی کی اور بات ہے۔''

''خاموش۔ سنو سب کیا باتیں کر رہے ہیں۔''

باہر سے آواز آئی: ''کواڑ کھول دو۔ نہیں تو ہم کواڑ توڑ کر اندر آ جائیں گے۔''

گجندر نے شیام دلاری کی منت کی: ''میری بات مانو تو شیاما، زیور اتار کر رکھ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد نئے زیور بنوا دوں گا۔''

باہر سے آواز آئی: ''کیوں شامتیں آئی ہیں۔ بس ایک منٹ کی مہلت اور دیتے ہیں اگر کواڑ نہ کھلے تو خیریت نہیں۔''

گجندر نے شیام دلاری سے پوچھا: ''کھول دوں؟''

''ہاں بلا لو۔ تمھارے بھائی بند ہیں نا۔ وہ دروازے کو باہر سے ڈھکیلتے ہیں تم اندر سے باہر کو ٹھیلو۔''

''اور جو دروازہ میرے اوپر گر پڑے۔ پانچ پانچ جوان ہیں۔''

''وہ کونے میں لاٹھی رکھی ہے، لے کر کھڑے ہو جاؤ۔''

''تم پاگل ہو گئی ہو!''

''چنو دادا ہوتے تو پانچوں کو گرا دیتے۔''

''میں لٹھ باز نہیں ہوں۔''

''تو آؤ منہ ڈھانپ کر لیٹ جاؤ۔ میں ان سب کو سمجھ لوں گی۔''

''تمھیں تو عورت سمجھ کر چھوڑ دیں گے۔ ماتھے میرے جائے گی۔''

''میں تو چلاتی ہوں۔''

''تم میری جان لے کر چھوڑو گی۔''

''مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا۔ میں کواڑ کھولے دیتا ہوں۔''

اس نے دروازہ کھول دیا۔ پانچوں چور کمرے میں بھڑ بھڑا کر گھس آئے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: ''میں اس لونڈے کو پکڑے ہوئے ہوں تم عورت کے سارے گہنے اتار لو۔''

دوسرا بولا: ''اس نے تو آنکھیں بند کر لیں۔ ارے تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتے جی؟''

تیسرا: ''عورت تو حسین ہے۔''

چوتھا: ''سنتی ہے او مہریا! زیور دے دے، نہیں گلا گھونٹ دوں گا۔''

گجندر دل میں بگڑ رہے تھے کہ یہ چڑیل زیور کیوں نہیں اتار دیتی۔

شیام دلاری نے کہا: ''گلا گھونٹ دو چاہے گولی مار دو۔ زیور نہ اتاروں گی۔''

پہلا: ''اسے اٹھا لے چلو۔ یوں نہ مانے گی۔ مندر خالی ہے۔''

دوسرا: ''بس یہی مناسب ہے۔ کیوں ری چھوکری ہمارے ساتھ چلے گی۔''

شیام دلاری: ''تمھارے منہ میں کالک لگا دوں گی۔''

تیسرا: ''نہ چلے گی تو اس لونڈے کو لے جا کر بیچ ڈالیں گے۔''

شیام دلاری: ''ایک ایک کے ہتھکڑی ڈلوا دوں گی۔''

چوتھا: ''کیوں اتنا بگڑتی ہے مہارانی۔ ذرا ہمارے ساتھ چلی کیوں نہیں چلتی۔ کیا ہم اس لونڈے سے بھی گئے گزرے ہیں۔ کیا رہ جائے گا اگر ہم تجھے زبردستی اٹھا لے جائیں گے۔ یوں سیدھی طرح نہیں مانتی ہو۔ تم جیسی ماہرو پر ظلم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔''

پانچواں: ''یا تو سارے زیور اتار کر دے یا ہمارے ساتھ چل۔''

شیام دلاری: ''کاکا آجائیں گے تو ایک ایک کی کھال ادھیڑ ڈالیں گے۔''

پہلا: ''یہ یوں نہ مانے گی۔ اس لونڈے کو اٹھا لے چلو۔ تب آپ ہی پیروں پر پڑے گی۔''

دو آدمیوں نے ایک چادر سے گجندر کے ہاتھ پانو باندھے۔ گجندر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ سانس تک نہ آتی تھی۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے: ''ہائے! کتنی بے وفا عورت ہے۔ زیور نہ دے گی چاہے یہ سب مجھے جان سے مار ڈالیں۔ اچھا زندہ بچوں گا تو دیکھوں گا۔ بات تک تو پوچھوں نہیں۔''

جب ڈاکوؤں نے گجندر کو اٹھا لیا اور لے کر آنگن میں جا پہنچے تو شیام دلاری دروازے پر

کھڑی ہوکر بولی: ''انھیں چھوڑ دوتو میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

پہلا: ''پہلے ہی کیوں نہ راضی ہوگئی، چلے گی نا؟''

شیام دلاری: ''چلوں گی، کہتی تو ہوں۔''

تیسرا: ''اچھا تو چل۔ ہم اسے چھوڑے دیتے ہیں۔''

دونوں چوروں نے گجندر کو لاکر چارپائی پر لٹا دیا اور شیام دلاری کو لے کر چل دیے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ گجندر نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کوئی نظر نہ آیا۔ اٹھ کر دروازے سے جھانکا۔ صحن میں بھی کوئی نہ تھا۔ تیر کی طرح نکل کر صدر دروازے پر آئے۔ لیکن باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ چاہا کہ صوبے دار صاحب کو جگائیں مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔

اسی وقت قہقہے کی آواز آئی۔ پانچ عورتیں چہل کرتی ہوئی شیام دلاری کو لے کر کمرے میں آگئیں۔ گجندر کا وہاں پتا نہ تھا۔

ایک: ''کہاں چلے گئے؟''

شیام دلاری: ''باہر چلے گئے ہوں گے۔''

دوسری: ''بہت شرمندہ ہوں گے۔''

تیسری: ''مارے خوف کے ان کی سانس تک بند ہوگئی تھی۔''

گجندر نے بول چال سنی تو جان میں جان آئی۔ سمجھے شاید گھر میں جاگ ہوگئی۔ لپک کر کمرے کے دروازے پر آئے اور بولے: ''ذرا دیکھیے، شیاما کہاں ہے؟ میری تو نیند ہی نہیں کھلی۔ جلد کسی کو دوڑائیے۔''

یکا یک انہیں عورتوں کے بیچ میں شیاما کو کھڑے ہنستے دیکھ کر حیرت میں آگئے۔

پانچوں سہیلیوں نے ہنسنا اور تالیاں پیٹنا شروع کر دیا۔

ایک نے کہا: ''واہ جیجا جی! دیکھ لی آپ کی بہادری۔''

شیام دلاری: ''تم سب کی سب شیطان ہو۔''

تیسری: ''بیوی تو چوروں کے ساتھ چلی گئی اور آپ نے سانس تک نہ لی۔''

گجندر سمجھ گئے بڑا دھوکا کھایا۔ مگر زبان کے شیر تھے۔ فوراً بگڑی بات بنالی۔ بولے: ''تو کیا تمھارا سوانگ بگاڑ دیتا۔ میں بھی اس تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اگر سبھوں کو پکڑ کر مونچھیں اکھاڑ لیتا تو تم کتنی شرمندہ ہوتیں۔ میں اتنا بے رحم نہیں ہوں۔''

سب کی سب گجندر کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

انصاف کی پولیس

(۱)

سیٹھ نانک چند نے آج پھر وہی لفافہ پایا اور وہی تحریر دیکھی تو ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ خط کھولتے ہی ہاتھ اور دل کانپنے لگے۔ خط میں کیا لکھا ہے ساتھیوں نے قیافے سے معلوم کر لیا تھا۔ اسی لفافہ اور اسی تحریر کے کئی خط یکے بعد دیگرے انہیں مل چکے تھے۔ اس خط کا بھی وہی مضمون ہوگا، اس میں مطلق شبہ نہ تھا۔ وہ خط کو کانپتے ہاتھوں میں لیے آسمان کی طرف تاکنے لگے گویا اس میں اپنا نوشتۂ تقدیر پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ دل کے مضبوط آدمی تھے۔ مُردوں سے بھی اپنی رقم وصول کر لیتے تھے۔ رحم یا رعایت یا دوسری کمزوریاں انہیں چھو بھی نہیں گئی تھیں ورنہ مہاجن ہی کیسے بنتے۔ وہ ہر پورن ماشی کو ستیہ نارائن کی کتھا سنتے تھے۔ پچھلے پندرہ سال میں اس معمول میں ایک ناغہ بھی نہ ہوا تھا۔ منگل یا کسی خاص دن مہابیر جی کو لڈو چڑھاتے تھے، روزانہ جمنا میں اشنان کرتے اور شیو جی کو جل چڑھاتے تھے۔ مہینے میں دو بار برہمنوں کو بھوجن بھی کراتے تھے اور جب سے گھی کے کاروبار میں نفع کثیر ہونے لگا تھا، ایک دھرم شالہ بنوانے کی فکر میں تھے۔ زمین طے کر لی تھی اور کسی اچھی مہورت کے منتظر تھے۔ انہوں نے خوب حساب کر کے دیکھ لیا تھا اس کارِ خیر میں ان کی جیب سے ایک کوڑی بھی نہ خرچ ہوگی۔ زمین ایک بیوہ کی تھی جس پر انہوں نے پہلے اپنی گائے، بھینسوں کے لیے ایک مختصر سا چھپّر ڈال لیا تھا اور جب بیوہ ایک نابالغ لڑکا چھوڑ کر مر گئی تو وقف زمین اس کے قبضے میں آ گئی۔ لڑکا اپنے ننھیال میں تھا اور ننھیال والوں کو توفیق نہ تھی، نہ اتنی فرصت کہ سیٹھ جی سے مقدمہ بازی کرتے۔ معمار سب ان کے اسامی تھی اور مزدوری کر کے سودا کرنا چاہتے تھے۔ اینٹ والا بھی ان سے کئی سال پہلے قرض لے گیا تھا اور اصل کی دو چند رقم ادا کر چکنے کے بعد بھی اس پر ان کے ہزاروں روپے نکلتے تھے، اس لیے یہ مرحلہ بھی طے تھا۔ صرف سیمنٹ اور چونے والے بیوپاری کے پھنسنے کا انتظار تھا۔ وہ دس بیس ہزار کی دستاویز لکھا لے، بس دھرم شالہ تیار ہے۔ ہر ایک کامیاب آدمی کی طرح دیوتاؤں پر ان کا پکا اعتقاد تھا جن کی دعا اور برکت سے انہیں کسی کاروبار میں گھاٹا نہیں ہوا، مگر جب سے یہ خطوط ملنے لگے تھے انہیں ایک وہم آمیز تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ رات کو ان کے

دروازے پر محض ایک چوکیدار رہتا ہے۔ اگر دس پانچ مسلح آدمی آجائیں تو وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے۔ شاید انہیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہو۔ ہم سایوں میں ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا جو خطرے کے وقت کام آئے۔ حالاں کہ سب ہی ان کے اسامی تھے یا رہ چکے تھے لیکن یہ فرقہ احسان فراموشوں کا ہے۔ جس کے دروازے پر ضرورت کے وقت ناک اور پیشانی رگڑتا ہے، اسی کے درپے آزار ہو جاتا ہے۔ احسان ماننا تو دور رہا الٹا بدخواہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے سوچا اگر رات کو دس پانچ آدمی آجائیں تو واقعی بڑی مشکل کا سامنا ہو۔ بے شک دروازہ مضبوط ہے اور اسے توڑنا آسان نہیں۔ جوڑیاں بھی جرمن ساخت کی ہیں جن پر کوئی حربہ اثر نہیں کر سکتا اور دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ ان پر کوئی کیا کھا کے چڑھے گا۔ نقب تو امر محال ہے۔ بیرونی دیوار خالص پتھر کی ہے۔ ایک ایک پتھر دس دس من کا ہے۔

اس خیال سے انہیں قدرے تشفی ہوئی۔ اپنی رائفل نکال کر انہوں نے اس کا خوب معائنہ کیا۔ موقع پڑنے پر اس سے بھی دس پانچ آدمیوں کو منٹوں میں بھون سکتے ہیں۔ پھر بھی ان پر ایک دہشت سی طاری ہو گئی۔ کون جانے یہ چوکیدار بھی ان ہی میں مل گیا ہو۔ خدمت گار بھی تھوڑے سے لالچ سے آستین کے سانپ ہو سکتے ہیں۔

آخر کئی منٹ کے روحانی انتشار کے بعد انہوں نے خط کھولا اور ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ سانس تیز چلنے لگی۔ فوراً دروازہ بند کر دیا اور خط لیے اندر آ کر کیسر سے بولے: ''دیکھتی ہو آج پھر وہی خط آیا۔ آج تو تاریخ بھی مقرر کر دی۔ پرسوں ان کا دھاوا ہو گا۔ لکھا ہے اگر اپنی جان عزیز ہے تو پچیس ہزار روپے نقد رامیشور کے مندر کے سامنے درخت کے نیچے آٹھ بجے رات کو رکھ دو۔ یہ سب سمجھتے ہوں گے کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے میں ڈر جاؤں گا۔''

کیسر پڑھنا نہ جانتی تھی۔ پھر بھی اس نے ان کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اس پر ایک نظر ڈال کر بولی: ''میں تو سوچتی ہوں مہینے دو مہینے کے لیے یہاں سے کہیں چلے چلیں، کاشی، پریاگ، ہردوار کہیں بھی۔ تیرتھ کا تیرتھ ہو جائے گا اور ذرا چین بھی نصیب ہو گا۔ مجھے تو مارے خوف کے رات کو نیند نہیں آتی۔''

سیٹھ جی دلیرانہ انداز سے بولے: ''اس طرح ایک ایک دھمکی میں بھاگنے لگوں تو مہاجنی کر چکا۔ یہ سب میرے ہی اسامی ہیں جن کی جائیدادیں میں نے نیلام کرائی ہیں۔ رائفل کی ایک آواز جہاں کی، ہرن ہو جائیں گے۔ پولیس کو بھی اطلاع کیے دیتا ہوں۔ میں نے ابھی تک پولیس کو خبر نہیں دی وہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیں گے اور دو چار ہزار روپے میری حفاظت کے بہانے سے وصول کر لیں گے۔ اور حفاظت جیسی وہ کریں گے وہ میں جانتا ہوں۔ لیکن اب اطلاع دے دوں گا۔ دو چار سو روپیوں کا منہ نہ دیکھوں گا۔ اپنی طرف سے ہوشیار رہنا اچھا ہے۔''

کیسر دوہرے بدن کی عورت تھی۔ نخل بے ثمر جو پت جھڑ میں بھی ہری ہری پتیوں سے لدا رہتا ہے۔ اولاد کی ناکام آرزو میں زندگی کا بڑا حصہ گزار چکنے کے بعد اب اس پر ہمیشہ ایک پُرخوف مایوسی طاری رہتی تھی۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں، پھر یہ زر و مال کس کے ہاتھ لگے گا۔ سب سے زیادہ خوف اسے بیماری کا تھا۔ اسے وہ موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی اور اس جامۂ ہستی کو اس وقت تک اتارنا نہ چاہتی تھی جب تک ایک تار بھی باقی رہے، بال بچے ہوتے تو وہ خوشی سے مرتی اور موت کو بلاتی، لیکن اب تو اس کی زندگی ہی اس کا خاتمہ تھا، پھر کیوں نہ وہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہے۔ اب تک تو صرف بیماری کا خوف تھا۔ اسے وہ دواؤں اور دعاؤں سے دور کرتی رہتی تھی اور گویا ایشور پر اپنی بے نیازی کا اظہار کرنے کے لیے ہمیشہ بنی ٹھنی رہتی تھی لیکن جب سے یہ خطوط آنے لگے تھے اس کا خوف بھوت کی طرح اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ منت آمیز لہجے میں بولی: ''پولیس کو اطلاع کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میری بات مانو، یہاں سے بھاگ چلو۔ میری بات کیوں نہیں مانتے۔ کیا کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ چور کوئی گھر کو تو اٹھا نہ لے جائے گا۔''

سیٹھ جی نے کیسر کی بدحواسی پر ترس کھا کر کہا: ''تم ناحق اتنا ڈرتی ہو کیسر۔ پولیس کو جب ضابطے کے ساتھ اطلاع دی جائے گی تو اس کا فرض ہو جائے گا کہ ہماری حفاظت کرے۔ ہم پانچ ہزار سالانہ ٹیکس دیتے ہیں۔ اگر پولیس نے سماعت نہ کی تو میں لاٹ صاحب سے کہوں گا جب سرکار ہم سے ٹیکس لیتی ہے تو ہماری جان و مال کی حفاظت کرنا اس کا قانونی فرض ہے۔''

سیاسیات کا یہ مسئلہ کیسر کی سمجھ میں کیا آتا وہ کسی طرح اس خوف سے نجات پانا چاہتی تھی جو اس کے دل میں سانپ کی طرح بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ پولیس کا اسے اب تک جو تجربہ تھا اس سے دل کو تقویت نہ ہوتی تھی۔ بولی: ''پولیس والے واردات کے وقت تو نظر نہیں آتے۔ جب واردات ہو جاتی ہے تب البتہ شان جتانے کے لیے آ پہنچتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ پولیس اور دھنش طوفان ختم ہو جانے کے بعد دکھائی دیتی ہے۔''

سیٹھ جی نے پولیس کی حمایت کی: ''پولیس والے تو سرکار کا راج چلا رہے ہیں تم کیا جانو۔''

کیسر نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا: ''اور میں کہتی ہوں کہ اگر واردات کل ہونے والی ہے تو پولیس کو خبر دینے سے آج ہو جائے گی۔ لوٹ کے مال میں ان کا ساجھا ہوتا ہے۔''

''جانتا ہوں۔ دیکھ چکا ہوں اور روز دیکھتا ہوں۔ لیکن کیا سرکار کو پانچ ہزار ٹیکس نہیں دیتے۔ اس پر داروغہ جی کو برابر پاپڑ واچار وغیرہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ ابھی جاڑوں میں سپرنٹنڈنٹ صاحب شکار کھیلنے آئے تھے تو میں نے کتنی رسد پہنچائی تھی۔ ایک کنستر گھی اور ایک بوری شکر تو ایک ہی دن بھیجی تھی۔ یہ سب کھانا پلانا کس دن کام آئے گا۔ ہاں یہ مانتا ہوں کہ آدمی کو بالکل دوسروں کے

بھروسے نہ بیٹھے رہنا چاہیے۔ اپنے قوت بازو سے بھی کام لینا چاہیے۔ میرا نشانہ تو بے خطا ہوتا ہی ہے آؤ تمھیں بھی بندوق چلانا سکھادوں۔''

یہ ایک مضحکہ خیز تجویز تھی۔

کیسر ہنس کر بولی: ''ہاں اور کیا۔ اب آج میں بندوق چلانا سیکھوں گی۔ تم کو جب دیکھو ہنسی ہی سوجھتی ہے۔''

سیٹھ جی نے کہا: ''اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ آج کل تو عورتیں فوج میں بھرتی ہورہی ہیں۔ سپاہیوں کی طرح عورتیں بھی قواعد کرتی ہیں، بندوق چلاتی ہیں۔''

کیسر نے اعتراض کیا: ''ولایت کی عورتیں چلاتی ہوں گی۔ یہاں کی عورتیں کیا چلائیں گی۔ ہاں انگل بھر کی زبان چاہے چلالیں۔''

سیٹھ جی نے اس فاسد خیال کی تصحیح کی: ''اب یہاں کی عورتیں بھی چلالی ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہم تم دونوں بندوق لے کر کھڑے ہوجائیں گے تو پچاس آدمی بھی اندر گھسنے کی ہمت نہ کرسکیں گے۔ عورت کے ہاتھ میں بندوق توپ سے بھی زیادہ قاتل ہوجاتی ہے۔''

کیسر نے آخری فیصلہ کیا: ''نا بابا! میں تو چور کی آواز سنتے ہی چکر کھا کر گر پڑوں گی۔''

اس وقت چوکیدار نے آکر کہا: ''داروغہ جی نے کئی کانسٹبل بھیجے ہیں وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

(۲)

سیٹھ جی باہر آئے تو کانسٹبلوں نے انہیں ادب سے سلام کیا اور ان میں سے ایک نے کہا: ''ہمیں داروغہ جی نے آپ کے پاس یہ دریافت کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ کے پاس دھمکی کی چٹھیاں تو نہیں آرہی ہیں۔ آج کل باہر سے ڈاکو اس علاقے میں آگئے ہیں اور لوٹ مار کی کئی وارداتیں ہوچکی ہیں۔''

سیٹھ جی نے کانسٹبلوں کو کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا: ''داروغہ جی کو کیسے معلوم ہوگیا۔ میرے پاس تو ایسے کئی خط آچکے ہیں۔ ایک آج بھی آیا ہے۔ میں خود داروغہ جی کو اطلاع دینے آرہا تھا۔''

ہیڈ کانسٹبل نے جواب دیا: ''حضور یہ نہ پوچھیں کہ داروغہ کو کیسے معلوم ہوگیا۔ علاقے کے سب سے بڑے سیٹھ کے پاس ایسے خط آئیں اور پولیس کو خبر نہ ہو۔ بھلا کوئی بات ہے، حکام کی برابر تاکید ہوتی رہتی ہے کہ سیٹھ جی کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔ حضور پانچ ہزار روپے سالانہ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہوتے مجال ہے کہ آپ کا بال بھی بیکا ہوجائے۔ آج داروغہ جی بڑی دیر تک اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ یہ ڈاکو اتنے دلیر اور تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ تھانے

سے باہران سے مقابلہ کرنا دشوار ہے۔ داروغہ جی نے سوچا تھا گاردمنگالیں گے۔ مگر ڈاکو کہیں ایک جگہ تو رہتے نہیں۔ آج یہاں ہیں تو کل یہاں سے دوسوکوس پر پہنچ گئے۔ گاردمنگا کر ہی کیا کر سکتے تھے۔ رعایا کی تو ہمیں فکر نہیں۔ کس کے پاس اتنا مال اسباب رکھا ہے کہ ڈاکوؤں کا اندیشہ ہو۔ اور اگر کسی کے پاس دو چار سو روپے نکل ہی آئے تو اس کے لیے پولیس ڈاکوؤں کے پیچھے اپنی جان ہتھیلی پر لیے نہ پھرے گی۔ ڈاکوؤں پر کوئی ذمہ داری نہیں وہ تو بے دریغ گولی چلاتے ہیں اور اکثر چھپ کر۔ ہمارے لیے تو ہزار بندشیں اور قیدیں ہیں۔ کوئی بات بگڑ جائے تو الٹی اپنی جان آفت میں پھنس جائے۔ اس لیے داروغہ جی نے ہمیں یہ پیغام دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ کو جس مال واسباب کے بارے میں خطرہ ہو اسے لاکر تھانے کے خزانے میں جمع کر دیجیے۔ آپ کو رسید دے دی جائے گی، آپ کا قفل لگا دیا جائے گا۔ صندوق پر آپ اپنی مہر لگا دیجیے گا۔ جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا ہو جائے تو آپ اپنی چیزیں واپس لے لیجیے گا۔ اس کے لیے سرکار آپ سے کسی قسم کی فیس نہیں لینا چاہتی۔ محض آپ کی حفاظت کے خیال سے یہ تجویز کی گئی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ کے دفتر سے اس قسم کا کوئی حکم آیا ہے کہ جو لوگ ایک ہزار یا اس سے زیادہ ٹیکس دیتے ہوں ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے ورنہ سخت جواب طلب کیا جائے گا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں پولیس اتنا بڑا جوکھم کیوں اپنے سر لیتی۔ اس سے آپ کو بھی بے فکری ہو جائے گی اور ہم بھی ذمہ داری سے بچ جائیں گے۔ ورنہ خدانخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو حضور کا جو نقصان ہو وہ تو ہو ہی، ہمارے اوپر بھی جواب دہی آ جائے۔ یہ ڈاکو اتنے ظالم ہیں کہ محض مال واسباب لے کر ہی جان نہیں چھوڑتے بلکہ خون بھی کر ڈالتے ہیں۔ اس لیے داروغہ جی نے بہت زور دے کر کہا ہے کہ آپ آج ہی خطرے والی چیزیں لے کر تھانے میں تشریف لے آئیں اور انہیں خزانے میں داخل کر کے رسید لے لیں۔ مزید اطمینان کے لیے آپ چاہیں تو اپنا ایک آدمی بھی وہاں تعینات کر سکتے ہیں۔ حضور کے پاس موٹر تو ہے ہی۔ ہم چار آدمی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ تحقیقی خبر ملی ہے کہ ڈاکوؤں کا غول اس علاقے میں آ گیا ہے۔ بیس آدمی ہیں اور سب کے سب مسلح وسادھو بنے ہوئے ہیں۔ دو پنجابیوں کے بھیس میں ہیں اور الوان اور دھمے بیچتے پھرتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ دو بہنگی بردار بھی ہیں۔ دو ڈاکو بلوچیوں کے بھیس میں چھریاں اور تالے بیچتے ہیں اور کہاں تک گناؤں ہمارے یہاں تو ان کا پورا حلیہ آ گیا ہے۔"

خطرے میں انسان کا دل کمزور ہو جاتا ہے اور ایسی باتوں کا بھی یقین کر لیتا ہے جو شاید ہوش وحواس کی حالت میں وہ نہ کرتا۔ یہاں تو شبہے کا موقع ہی نہ تھا۔ ممکن ہے اس میں داروغہ جی کی کوئی غرض شامل ہو اور وہ اس خدمت کا کچھ صلہ بھی چاہتے ہوں۔ اس کے لیے سیٹھ جی تیار تھے کہ

اگر دو چار سو روپے دینے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسے واقعے تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ موجودہ حالت میں اس سے بہتر کوئی انتظام خیال میں نہیں آتا تھا، بلکہ اسے امدادِ غیب سمجھنا چاہیے۔ انہیں کانسٹبلوں کو کچھ دے دلا کر ساری چیزیں نکلوالیں گے۔ دوسروں کا کیا بھروسا، کہیں ڈاکوؤں سے مل جائیں تو غضب ہی ہو جائے۔ راستے ہی میں گھیر لیے جائیں۔ بیس کے مقابلے میں چار آدمی کر ہی کیا سکتے ہیں اور کون جانے کہ ڈاکوؤں کے پاس کار نہ ہوگی۔

پھر بھی اس انداز سے بولے گویا داروغہ جی نے ان پر کوئی خاص عنایت نہیں کی ہے: ''یہ تو ان کا فرض ہی تھا۔ میں اس عنایت کے لیے داروغہ جی کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ مگر میں نے یہاں ایسا انتظام کر لیا تھا کہ اگر ڈاکو یہاں آتے تو ان کے دانت کھٹے کر دیے جاتے۔ سارا محلہ مقابلے کے لیے تیار تھا۔ سب ہی سے تو اپنا یارانہ ہے مگر داروغہ جی کی تجویز مجھے پسند ہے، اس سے وہ بھی اپنی ذمے داری سے بَری ہو جاتے ہیں اور میرے سر سے بھی فکر کا بوجھ اتر جاتا ہے جیسا آپ نے خود کہا، لیکن اندر سے چیزوں کو نکال نکال کر باہر لانا اور کار میں رکھنا میرے بوتے کی بات نہیں۔ آپ کی دعا سے آدمی تو کافی ہیں مگر کس کی نیت کیسی ہے یہ کون جانتا ہے۔ آپ لوگ کچھ مدد کریں تو کام آسان ہو جائے (مسکرا کر) آپ کی محنت رائگاں نہ جائے گی۔''

کیسر نے اس تجویز کو لبیک کہا۔ کانسٹبلوں نے بھی اپنی خدمات خوشی سے پیش کیں۔ ہیڈ کانسٹبل نے کہا: ''ہم حضور کے تابع دار ہیں۔ اس میں مدد کی کون سی بات ہے۔ تنخواہ سرکار سے ضرور پاتے ہیں مگر دیتے تو حضور ہی ہیں۔ آپ ضرور بتاتے جایئے۔ ہم لوگ آن کی آن میں سارا سامان نکال کر رکھ دیں گے۔''

کیسر نے خوش ہو کر کہا: ''بھگوان نے مدد کر دی، نہیں تو میں بہت گھبرا رہی تھی۔ جان نکلی جاتی تھی۔''

سیٹھ جی نے ہمہ دانی کے انداز سے کہا: ''اسی کو کہتے ہیں سرکار کا انتظام! اسی مستعدی کی بدولت سرکاری راج تھما ہوا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کوئی قیمتی چیز یہاں نہ چھوڑی جائے تاکہ وہ آئیں تو اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں۔''

کیسر نے جھک کر کہا: ''کنجی ان سبھوں کے سامنے پھینک دینا کہ جو چیز چاہو نکال لے جاؤ۔''

دو کانسٹبلوں نے اندر جا کر صندوقچے اور پٹارے نکالنے شروع کیے۔ ایک باہر سامان کار پر لاد رہا تھا اور ہیڈ کانسٹبل نوٹ بک پر ہر ایک چیز کا اندراج کر رہا تھا۔ زیورات، اشرفیاں، نوٹ، بیش قیمت کپڑے، شال دوشالے، نقرئی ظروف سب کار میں رکھ دیے گئے۔ معمولی فرنیچر، برتن، فرش فروش اور غلہ وغیرہ کے سوا گھر میں اور کچھ نہ بچا اور یہ چیزیں ڈاکوؤں کے لیے بے مصرف ہیں۔ کیسر کا سنگاردان سیٹھ جی خود لائے اور ہیڈ کانسٹبل کو دے کو بولے: ''بھئی اسے بڑی حفاظت سے رکھنا۔''

ہیڈ کانسٹبل نے سنگاردان لے کر کہا: ''میرے لیے ہر ایک تنکا اتنا ہی بیش قیمت ہے۔''
سیٹھ جی کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوا۔ کہا: ''اس فہرست کی ایک نقل مجھے بھی دے دیجیے''
ہیڈ کانسٹبل نے کہا: ''وہ آپ کو تھانے میں باضابطہ دی جائے گی۔''
''کیوں نہ یہیں دے دیجئے؟''
''یہاں لکھنے میں دیر ہوگی اور پھر جب تک داروغہ جی کے دستخط نہ ہوں اس رسید کی وقعت ہی کیا؟ مگر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا؟''
سیٹھ جی نے نادم ہو کر کہا: ''شبہ نہیں تھا۔ میں نے سمجھا ایک رسید میرے پاس بھی ہوتی تو اچھا تھا۔''
ہیڈ کانسٹبل نے بے رُخی سے کہا: ''اگر آپ کے دل میں کسی قسم کا شبہ ہو تو آپ چیزیں اپنے گھر ہی میں رکھیں۔ ہم یہاں بھی آپ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ مگر ہاں! اس حالت میں ذمہ داری آپ کی رہے گی۔''
سیٹھ جی اور نادم ہوئے: ''نہیں نہیں صاحب! شبہے کی بات نہیں تھی۔ یوں ہی ایک خیال آ گیا۔ آپ کہتے ہیں رسید تھانے میں مل جائے گی، میں بھی مانتا ہوں۔''
کار پر سارا سامان رکھ دیا گیا۔ محلے کے سیکڑوں آدمی تماشا دیکھ رہے تھے۔ کار بہت بڑی تھی۔ مگر بالکل بھر گئی۔ پانچ آدمیوں کے لیے بڑی مشکل سے جگہ نکلی۔ سیٹھ جی تو پیچھے والی جگہ پر بیٹھے۔ باقی چاروں آدمی اگلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ کیسر دروازے پر اس انداز سے کھڑی تھی گویا اس کی لڑکی رخصت ہو رہی ہو۔

(۳)

پانچ میل کا سفر تھا۔ قصبے سے باہر نکلتے ہی پہاڑوں کی خاموش اور اودی بلندیاں نظر آئیں، جن کے دامن میں ہرا بھرا سبزہ زار تھا اور اس میدان کے بیچ سے سرخ بجری کی سڑک سیندور بھری مانگ کی طرح نکل گئی تھی۔ ایک میل جانے کے بعد ہیڈ کانسٹبل نے سیٹھ جی سے پوچھا:
''یہ کہاں تک صحیح ہے کہ پچیس سال پہلے آپ یہاں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے؟''
نانک چند تفاخر کے انداز سے بولے: ''بالکل صحیح ہے خاں صاحب! میرے پاس کل تین روپے تھے۔ لٹیا ڈور کندھے پر تھی اور چھڑی ہاتھ میں۔ بس بھگوان کا بھروسا تھا۔ بالکل تقدیر کا کھیل ہے۔ اور بھگوان کی مرضی چاہیے۔ آدمی کے بنتے بگڑتے دیر نہیں لگتی۔''
''میں نے سنا ہے آپ دوسرے سیٹھ ساہوکاروں کی طرح بخیل نہیں ہیں۔''

''میرا اصول ہے کہ اصلی بچت وہی ہے جو آرام سے زندگی بسر کرنے کے بعد بچ رہے۔ جب بہت تھوڑی دولت تھی تب بھی میرا یہی اصول تھا۔''

''آخر یہ دولت آپ کو ملی کہاں سے؟''

''آڑھت، لین دین، رہن، بیع سب ہی کچھ تو ہے خاں صاحب! یہ سمجھ لیجیے کہ صبح سے آدھی رات تک سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ صرف کھانا کھانے اندر جاتا ہوں۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں۔ محنت کے بغیر کسی کام میں کامیابی نہیں ہوتی۔ آپ کو اپنے ہاتھ سے بھی بہت سا کام کرنا پڑتا ہوگا۔''

''کچھ نہیں صاحب، نوکر چاکر سب کچھ کر لیتے ہیں۔ میں بیٹھا نگرانی کرتا ہوں۔''

''آپ نے کئی لاکھ پیدا کیے ہوں گے۔''

''دو سوا دو لاکھ کی جائیداد ہے خاں صاحب! بیس ہزار کا تو مکان ہی کھڑا ہے۔ آج بیچوں تو پچاس ہزار سے کم نہ ملے۔''

''لیکن اصل سرمایہ وہی آپ کے تین روپے تھے؟''

''سرمایہ تو آدمی کی ساکھ ہے خاں صاحب! آج چاہوں تو کہیں سے لاکھوں کا مال منگا سکتا ہوں۔''

''آپ کی زندگی واقعی ہمارے لیے نمونہ ہے۔''

''آپ لوگوں کی دعا سے اب تک تو آرام سے کٹ گئی ہے۔ آگے بھگوان جانے۔''

''اب تو اور بھی آرام سے کٹے گی کیوں کہ آپ کی ساکھ بہت بڑھ گئی ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے خاں صاحب! اپنی ساکھ تو بنانے سے بنتی ہے۔''

''یہ مال و اسباب اور جائیداد آپ کے لیے فضول ہے۔ آپ اپنی ساکھ سے اپنا روزگار کر سکتے ہیں۔''

''بہت اچھی طرح خاں صاحب! یہ سب تو مایا جال ہے جس میں پھنس جانے کے بعد پھر نجات نہیں ملتی۔ مر کر ہی گلا چھوٹتا ہے۔ اب دھرم شالا بنوانے کا ارادہ ہے۔ سامان کر لیا ہے۔ کوئی اچھی مہورت دیکھ کر ہاتھ لگا دینا ہے۔ ایک لڑکا بھی گود لینا چاہتا ہوں، بس پھر بھگوان کا بھجن کروں گا۔''

''آپ کے کوئی اولاد ہوئی ہی نہیں؟''

''تقدیر میں نہ تھی خاں صاحب! اور کیا کہوں۔ جن کے گھر میں بھونی بھانگ نہیں ان کے ہاں تو گھاس پھوس کی طرح بچے نکلتے آتے ہیں۔ جنہیں بھگوان نے کھانے کو دیا ہے وہ اولاد کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے ہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، سیٹھ جی! آپ کی باتیں بڑی پُرمغز ہوتی ہیں۔ اگر ہم آپ کو اس مایا جال سے چھڑا دیں تو یقیناً آپ ہمارے احسان مند ہوں گے۔''

سیٹھ جی ہنسے اور بولے: ''بھگوان کے سوا اس مایا جال سے کون چھڑا سکتا ہے خاں صاحب!''

ہیڈ کانسٹبل نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا: ''بھگوان کیوں چھڑانے لگے۔ آپ خود کیوں نہیں چھوٹ جاتے۔ جس دولت سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں اسے کیوں نہ غریبوں میں تقسیم کر دیجیے۔ بے فائدہ سینے پر بوجھ لادنے سے کیا مطلب؟''

''بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے خاں صاحب! مایا جال کہیں ٹوٹ سکتا ہے؟''

''میں تو توڑنے کو تیار ہوں اسی وقت۔''

''اسی دولت کے لیے آدمی اپنا خون پسینا ایک کر دیتا ہے۔ خاں صاحب! دغا، فریب، بے ایمانی اور ظلم سب کچھ اسی کے لیے کرتا ہے۔ بغیر اپنا ضمیر بیچے دولت نہیں ملتی۔ ایسی بیش قیمت چیز کون چھوڑ سکتا ہے۔''

''لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ صرف آپ کے اقبال کا ظہور ہے۔ آپ نے کوئی خاص محنت نہیں کی۔''

''نگرانی میں کچھ کم محنت ہے خاں صاحب!''

''آپ دن بھر دھوپ میں ٹھیلہ کھینچنا پسند کریں گے یا گدّی پر بیٹھے نگرانی کرنا۔''

''مگر سب آدمی سب ہی کام تو نہیں کر سکتے۔''

''آخر یہ روپیا آپ کے پاس آیا کہاں سے؟ آپ نے کسی اسامی کو سو روپے قرض دیے، یقیناً اس سے کچھ نہ کچھ سود لیا ہی ہوگا۔ کبھی کبھی تو سو کے دو سو، تین سو، چار سو تک وصول کیے ہوں گے۔ آپ کے روپے نے تو بچّے دیے نہیں۔ اسامی کی محنت کے روپے آپ کے ہاتھ لگے۔ بسا اوقات دو چار سو روپے قرض دے کر آپ نے پورے خاندان کو اپنا غلام بنا لیا ہوگا اور ان کی شبانہ روز کی مشقت کی کمائی آپ کے ہاتھ لگی ہوگی۔''

سیٹھ جی نے حیرت کی نگاہ سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ تو کوئی بڑا عجیب آدمی ہے۔ خواہ مخواہ بحث کر رہا ہے۔ مانا میں نے دوسروں کی محنت سے ہی دولت پیدا کی تو پھر؟ جو سب کرتے ہیں وہی میں نے کیا۔ کوئی نئی بات نہیں کی۔ بولے: ''اس طرح تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سب ہی دولت مند مفت خور ہیں۔''

خاں صاحب نے اس کی تائید کی: ''بے شک، میں بڑے زور سے یہ دعوا کرتا ہوں، یہاں تک کہ سب ہی سلطنتیں اسی ذیل میں آجاتی ہیں۔ فرق یہی ہے کہ آپ اسامیوں سے روپے

وصول کر کے جمع رکھ چھوڑتے ہیں۔ جب کہ سرکار اس سے ملک کا انتظام کرتی ہے۔ عدالتیں اور پولیس قائم کرتی ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی بہ اطمینان اُن غربا کا خون چوس سکیں اگر کوئی غریب سرکشی کرے اور آپ کا منہ اپنی رگ سے ہٹا دینا چاہے تو سرکار کی پولیس اور عدالت اور فوج آپ کی مدد کرے۔ دراصل آپ نے سود یا نفع یا مال گذاری کی شکل میں جو کچھ بھی پایا ہے وہ غریبوں کی کمائی ہے جو آپ نے ان سے جبراً چھین لیا ہے اور جو آپ ہی کے لفظوں میں آپ کے پاس بیکار پڑی ہوئی ہے۔ آپ کو مسروقہ مال گھر میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ ان چیزوں کو پولیس کے حوالے کر کے گھر کی راہ لیجیے۔ ہم سرکاری پولیس کے سپاہی نہیں، انصاف کی پولیس کے سپاہی ہیں۔ ہم نے متواتر خطوط سے آپ کو آگاہ کیا۔ یہاں تک کہا کہ آپ ہمیں صرف پچیس ہزار روپے دے دیجیے لیکن آپ سرکاری امداد کے زعم میں بیٹھے رہے۔ مجبوراً ہمیں یہ چال چلنی پڑی۔''

سیٹھ جی کا خون خشک ہو گیا۔ لیکن نہیں یہ پولیس والے مجھے ڈرا رہے ہیں اور اب میری بزدلانہ بدحواسی کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ بولے: ''خاں صاحب! آپ بڑے دل لگی باز ہیں لیکن سچ مچ ڈاکوؤں نے یہ چال چلی ہوتی تو اس وقت میں دھوکے میں آ چکا ہوتا۔''

''تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ڈاکوؤں نے سچ مچ آپ کے ساتھ یہ چال چلی ہے اور آپ دھوکے میں آ گئے ہیں۔ اس میں شک و شبہہ کی گنجایش نہیں۔''

گاڑی رک گئی۔ سیٹھ جی ڈھکیل کر نیچے گرا دیے گئے اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلی۔ سیٹھ جی چلاتے ہوئے موٹر کے پیچھے دوڑے۔

''حضور سرکار، بھائیو! بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ رحم کیجیے۔ میں خوشی سے آپ کو پچیس ہزار دے دوں گا۔ آپ نے کہا ہے آپ انصاف کی پولیس ہیں یہ بے انصافی نہ کیجیے۔''

خاں صاحب نے دروازے سے سر نکال کر کہا: ''کاش! یہ پچیس ہزار آپ نے پہلے دے دیے ہوتے۔ اب تو میعاد گزر گئی۔ اپنے کو کتنے خطرے میں ڈال کر ہم نے یہ دولت پائی ہے، اس کا خیال کیجیے۔ آپ کو ذرا بھی شبہہ ہو جاتا تو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں اور بے بھاؤ کی پڑ رہی ہوتی۔ اب آپ آرام سے تشریف لے جایئے۔ یہ دو تین روپے ہیں جو آپ ساتھ لے کر یہاں آئے تھے۔ اب جا کر پھر دولت جمع کیجیے۔ دس پانچ برس میں ہم پھر آپ کو مایا جال سے نکال لیں گے۔''

موٹر تیز ہو گئی اور سیٹھ جی چیختے رہ گئے۔

''دوڑو، دوڑو! ڈاکو مجھے لوٹے لیے جا رہے ہیں۔''

لیکن وہ ساری فریاد فریادِ صحرا تھی۔

☆☆☆

غم نداری بُز بخر

ان دنوں دودھ کی تکلیف تھی۔ کئی ڈیری فارموں کی آزمایش کی، اہیروں کا امتحان لیا، کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دو چار دن تو دودھ اچھا ملتا، پھر آمیزش شروع ہو جاتا۔ کبھی شکایت ہوتی دودھ پھٹ گیا، کبھی اس میں سے ناگوار بو آنے لگتی، کبھی کبھی مکھن کے ریزے نکلتے۔ آخر ایک دن ایک دوست سے کہا: ''بھئی، آؤ ساجھے میں ایک گائے لے لیں۔ تمھیں بھی دودھ کا آرام ہو جائے گا، مجھے بھی۔ لاگت آدھی آدھی، خرچ آدھا آدھا، دودھ بھی آدھا آدھا۔'' دوست صاحب راضی ہو گئے۔ میرے گھر میں جگہ نہ تھی اور گوبر وغیرہ سے مجھے نفرت ہے۔ ان کے مکان میں کافی جگہ تھی۔ اس لیے تجویز ہوئی کہ گائے انہیں کے گھر رہے۔ اس کے عوض انھیں گوبر پر بلاشرکت غیرے اختیار ہے۔ وہ اسے کامل آزادی سے تھاپیں، اُپلے بنائیں، گھر لیپیں، پڑوسیوں کو دیں یا اسے کسی طبی مصرف میں لائیں، منمقر کو اس میں کسی قسم کا اعتراض، احتجاج یا قیل وقال نہ ہوگا اور منمقر بہ صحت ہوش وحواس و بہ اصابت عقل اقرار کرتا ہے کہ وہ گوبر پر کبھی دستِ تصرّف دراز نہ کرے گا اور نہ کسی کو تصرّف کے لیے آمادہ کرے گا۔

دودھ آنے لگا۔ روز روز کی ضیق سے نجات ملی۔ ایک ہفتہ تک کسی قسم کی شکایت نہ پیدا ہوئی۔ گرم گرم دودھ پیتا تھا اور خوش ہو کر گاتا تھا۔

رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی
تازہ دودھ پلایا اس نے — لطفِ حیات چکھایا اس نے
دودھ میں بھیگی روٹی میری — اس کے کرم نے بخشی سیری
خدا کی رحمت کی ہے مورت — کیسی بھولی بھالی صورت

مگر رفتہ رفتہ یہاں بھی پرانی شکایتیں پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ دودھ صرف نام کا دودھ رہ گیا۔ کتنا ہی ابالو، نہ کہیں ملائی کا پتا، نہ مٹھاس کا۔ پہلے تو شکایت کر لیا کرتا تھا۔ اس سے دل کا بخار نکل جاتا تھا۔ شکایت سے اصلاح نہ ہوئی تو دودھ بند کر دیتا تھا۔ اب تو شکایت کا بھی موقع نہ تھا۔ بند کر دینے کا ذکر ہی کیا۔ قہر درویش بر جانِ درویش، پیو یا نالی میں ڈال دو۔ آٹھ روز کا نسخہ نوشتہ قسمت تھا۔ بچہ دودھ کو منہ نہ لگاتا، پینا تو دور رہا۔ آدھوں آدھ شکر ڈال کر کچھ دنوں دودھ پلایا تو پھوڑے نکلنے شروع ہوئے اور میرے گھر

میں روز بم چخ مچی رہتی تھی۔ بیوی نوکر سے فرماتیں: ''دودھ لے کر جا انھیں کے سر پٹک آ۔'' میں نوکر کو منع کرتا۔ وہ کہتیں: ''اچھے دوست ہیں تمھارے، اسے شرم نہیں آتی۔ کیا اتنا احمق ہے کہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ دودھ دیکھ کر کیا کہیں گے؟ گائے کو اپنے گھر منگوالو۔ بلا سے بدبو آئے گی، مچھر ہوں گے، دودھ تو اچھا ملے گا۔ روپے خرچ ہیں تو اس کی لذت تو ملے گی۔'' چڈھا صاحب میرے پرانے مہربان ہیں۔ خاصی بے تکلفی ہے۔ ان سے یہ حرکت ان کے علم میں ہوتی ہو اسے قیاس باور نہیں کرتا۔ یا تو ان کی بیوی کی شرارت ہے، یا نوکر کی۔ لیکن ذکر کیسے کروں اور پھر ان کی بیوی سے بھی تو راہ ورسم ہے۔ کئی بار میرے گھر آچکی ہیں۔ میری دیوی جی بھی ان کے ہاں کئی بار مہمان جا چکی ہیں۔ کیا وہ یکا یک اتنی بے وقوف ہو جائیں گی۔ صریح آنکھوں میں دھول جھونکیں گی اور پھر چاہے کسی کی شرارت ہو، میرے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ ان سے دودھ کی خرابی کی شکایت کرتا۔ خیریت یہ ہوئی کہ تیسرے مہینے چڈھا کا تبادلہ ہو گیا۔ میں تنہا گائے نہ رکھ سکتا تھا۔ ساجھا ٹوٹ گیا۔ گائے آدھے داموں میں بیچ دی گئی۔ میں نے اس دن اطمینان کا سانس لیا۔

آخر یہ صلاح ہوئی کہ ایک بکری رکھ لی جائے۔ وہ بیچ آنگن میں ایک گوشے میں پڑی رہ سکتی ہے۔ اسے رکھنے کے لیے نہ گوالے کی ضرورت ہے، نہ اس کا گوبر اٹھانے، ناند دھونے، چارہ بھوسا ڈالنے کے لیے کسی اہیرن کی ضرورت۔ بکری تو میرا ملازم بھی آسانی سے دوہ لے گا۔ تھوڑی سی چوکر ڈال دی، چلیے قصہ تمام ہوا۔ پھر بکری کا دودھ مفید بھی زیادہ ہے۔ بچوں کے لیے خاص طور پر زود ہضم، معتدل، صحت بخش۔ حسن اتفاق سے میرے یہاں جو پنڈت جی میرے مسوّدے نقل کرنے آیا کرتے تھے ان معاملات میں کافی تجربہ کار تھے۔ ان سے ذکر آیا تو انھوں نے ایک بکری کی ایسی قصیدہ خوانی کی کہ میں اس کا نادیدہ عاشق ہو گیا۔ پچھائیں نسل کی بکری ہے، اونچے قد کی، بڑے بڑے تھن جو زمین سے لگے چلتے ہیں۔ بے حد کم خور لیکن بے حد دودھ ہار۔ ایک وقت میں دو ڈھائی سیر دودھ لے لیجیے۔ ابھی پہلی مرتبہ ہی بیاہی ہے۔ ۲۵ روپے میں آجائے گی۔ مجھے دام کچھ زیادہ معلوم ہوئے۔ لیکن پنڈت جی پر مجھے اعتبار تھا۔ فرمائش کر دی گئی اور تیسرے دن بکری آپہنچی۔ میں دیکھ کر اچھل پڑا۔ جو اوصاف بیان کیے گئے تھے ان سے کچھ زیادہ ہی نکلے۔ ایک چھوٹی سی مٹی کی ناند منگوائی گئی۔ چوکر کا بھی انتظام ہو گیا۔ شام کو میرے خدمت گار نے دودھ نکالا تو سچ مچ ڈھائی سیر۔ میری چھوٹی پتیلی لبریز ہو گئی تھی۔ اب موسلوں ڈھول بجائیں گے۔ یہ مسئلہ اتنے دنوں کے بعد جا کے کہیں حل ہوا ہے۔ پہلے ہی یہ بات سوجھتی تو کیوں اتنی پریشانی ہوتی۔ پنڈت جی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ مجھے علی الصبح اور شام کو سینگ پکڑنے پڑتے تھے تب آدمی دودھ نکالتا تھا لیکن یہ تکلیف اس دودھ کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔ بکری کیا ہے کام دھین ہے۔ بیوی نے سوچا اسے کہیں نظر نہ لگ جائے اس لیے اس کے تھن کے لیے غلاف تیار ہوا۔ اس کی گردن میں نیلے چینی کے دانوں کی ایک مالا پہنائی گئی۔ گھر میں جو کچھ جھوٹا بچتا دیوی جی خود جا کر اسے کھلا آتی تھیں۔

لیکن ایک ہفتے ہیں دودھ کی مقدار کم ہونے لگی۔ ضرور نظر لگ گئی۔ بات کیا ہے؟ پنڈت جی سے حال کہا تو انھوں نے کہا: ''صاحب دیہات کی بکری ہے زمیندار کی! بے دریغ اناج کھاتی تھی اور سارے دن باغ میں گھوما چرا کرتی تھی۔ یہاں بندھے بندھے دودھ کم ہو جائے تو تعجب نہیں۔ اسے ذرا ٹہلا دیا کیجیے۔''

لیکن شہر میں بکری کو ٹہلائے کون اور کہاں؟ اس لیے یہ طے ہوا کہ مضافات میں مکان لیا جائے۔ وہاں بستی سے ذرا دور نکل کر کھیت اور باغ ہوں گے۔ کہار گھنٹے دو گھنٹے ٹہلا لایا کرے گا۔ جھٹ پٹ مکان تبدیل کیا اور ہر چند مجھے دفتر آنے جانے میں تین میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا لیکن اچھا دودھ ملے تو میں اس کا دوگنا فاصلہ طے کرنے کو تیار۔ یہاں مکان کشادہ تھا۔ مکان کے سامنے صحن تھا۔ ذرا اور بڑھ کر آم اور مہوے وغیرہ کے باغ۔ باغ سے نکلیے تو کاچھیوں کے کھیت تھے۔ کسی میں آلو، کسی میں گوبھی۔ ایک کاچھی سے طے کر لیا کہ روزانہ بکری کے لیے ہریالی دے جایا کرے، مگر اتنی کوشش کرنے پر بھی دودھ کی مقدار میں کوئی خاص بیشی نہ ہوئی۔ ڈھائی سیر کی جگہ مشکل سے سیر بھر دودھ نکلتا تھا۔ لیکن یہ تسکین تھی کہ دودھ خالص ہے۔ یہی کیا کم ہے۔

میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ خدمت گاری کے مقابلے میں بکری چَرانا زیادہ ذلیل کام ہے۔ ہمارے دیوتاؤں اور نبیوں کا نہایت معزز طبقہ گلّہ بانی کیا کرتا تھا۔ کرشن جی گائیں چَراتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس گلّے میں بکریاں نہ رہی ہوں گی۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ دونوں ہی بھیڑیں چَراتے تھے۔ لیکن انسان روایات کا غلام ہے۔ جو بزرگوں نے نہیں کیا اسے وہ کیسے کرے۔ نئے راستے پر چلنے کے لیے جس عزم اور پختہ یقین کی ضرورت ہے وہ ہر ایک میں تو ہوتا نہیں۔ دھوبی آپ کے غلیظ کپڑے دھو لے گا لیکن آپ کے دروازے پر جھاڑو لگانے میں اپنی ہتک سمجھتا ہے۔ جرائم پیشہ اقوام کے فرد بازار سے قیمتاً کوئی چیز خریدنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ میرے خدمت گار کو بکری لے کر باغ میں جانا برا معلوم ہوتا تھا۔ گھر سے تو لے جاتا لیکن باغ میں اسے چھوڑ کر خود کسی درخت کے نیچے سو جاتا۔ بکری پتیاں چَر لیتی تھی۔ مگر ایک دن اس کے جی میں آیا کہ ذرا باغ سے نکل کر کھیتوں کی سیر کرے۔ یوں وہ بہت ہی شستہ مزاج اور وضع دار بکری تھی۔ اس کی صورت سے متانت اور تحمل جھلکتا تھا۔ لیکن باغ اور کھیت میں اسے یکساں آزادی نہیں ہے۔ اسے وہ شاید نہ سمجھ سکی۔ ایک روز کسی کھیت میں گھس گئی اور گوبھی کی کئی کیاریاں صاف کر گئی۔ کاچھی نے دیکھا تو اس کے کان پکڑ لیے اور میرے پاس آ کر بولا: ''بابو جی اس طرح آپ کی بکری ہمارے کھیت میں چرے گی تو ہم تو تباہ ہو جائیں گے۔ آپ کو بکری رکھنے کا شوق ہے تو اسے باندھ کر رکھیے۔ آج تو ہم نے تمھارا لحاظ رکھ لیا لیکن پھر ہمارے کھیت میں گئی تو ہم یا تو اس کی ٹانگ توڑ دیں گے یا کانجی ہاؤس میں بھیج دیں گے۔'' ابھی وہ اپنی تقریر ختم نہ کرنے پایا تھا کہ اس کی بیوی آ پہنچی اور اس نے اسی

خیال کو زیادہ پُر زور الفاظ میں ادا کیا: ''ہاں ہاں کرتی رہی مگر رانڈ کھیت میں گھس گئی اور سارا کھیت چوپٹ کر دیا۔ اس کے پیٹ میں بھوانی بیٹھیں۔ یہاں کوئی تمھارا دبیل نہیں ہے۔ حاکم ہوگے اپنے گھر کے ہوگے۔ بکری رکھنا ہے تو باندھ کر رکھو، نہیں گلا اینٹھ دوں گی۔'' میں بھیگی بلی بنا ہوا کھڑا تھا۔ جتنی پھٹکار آج سہنی پڑی، اتنی زندگی میں کبھی نہ سہی تھی اور جس تحمل سے آج کام لیا اگر اس سے دوسرے موقعوں پر کام لیا ہوتا تو آج آدمی ہوتا۔ کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ بکری کا گلا گھونٹ دوں اور خدمت گار کے ڈیڑھ سو ہنٹر جماؤں۔ میری خموشی سے وہ خاتون اور بھی شیر ہوئی جاتی تھی۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ بعض موقعوں پر خاموشی مضر ثابت ہوتی ہے۔ بارے میری اہلیہ نے گھر میں یہ غل گپاڑہ سنا تو دروازے پر آ گئیں اور ہیکڑی سے بولیں: ''تو کانجی ہاؤس پہنچا دے اور کیا کرے گی۔ ناحق بڑبڑ کر رہی ہے گھنٹے بھر سے۔ جانور ہی ہے ایک دن کھل گئی تو کیا اس کی جان لے گی۔ خبردار جواب ایک بات بھی منہ سے نکالی ہوگی۔ کیوں نہیں کھیت کے چاروں طرف جھاڑ لگا دیتی۔ کانٹوں سے روندھ دے۔ اپنی غلطی تو مانتی نہیں، اوپر سے لڑنے آتی ہے۔ ابھی پولیس کو اطلاع کر دیں تو بندھے بندھے پھرو۔''

اس تحکمانہ انداز بیان نے ان دونوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں نے دیوی جی کی خوب خبر لی: ''غریبوں کا نقصان بھی کرتے ہو اوپر سے رعب جماتی ہو۔ اسی کا نام انصاف ہے؟'' دیوی جی نے انداز تفاخر سے جواب دیا: ''میرا احسان تو نہ مانو گے کہ شیطان کو کتنی آسانی سے دفع کر دیا، لگے الٹے ڈانٹنے۔ گنواروں کو راہ پر لانے کا سختی کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔ شرافت یا فیاضی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے یہ لوگ کمزوری سمجھتے ہیں اور کمزور کو کون نہیں دبانا چاہتا؟''

خدمت گار سے جواب طلب کیا تو اس نے صاف کہہ دیا: ''صاحب بکری چَرانا میرا کام نہیں ہے۔''

میں نے کہا: ''تم سے بکری چَرانے کو کون کہتا ہے۔ ذرا اسے دیکھتے رہا کرو کہ کسی کھیت میں نہ جائے۔ اتنا بھی تم سے نہیں ہوسکتا۔''

''میں بکری نہیں چَرا سکتا صاحب! کوئی دوسرا آدمی رکھ لیجیے۔''

آخر میں نے خود شام کو اسے باغ میں چرانے کا فیصلہ کیا۔ اتنے ذرا سے کام کے لیے ایک نیا آدمی رکھنا میری حیثیت سے باہر تھا اور اپنے خدمت گار کو بھی جواب دینا نہیں چاہتا تھا، جس نے کئی سال تک وفاداری سے میری خدمت کی تھی اور ایمان دار تھا۔ دوسرے دن میں دفتر سے ذرا جلد چلا آیا اور چٹ پٹ بکری کو لے کر باغ میں جا پہنچا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے نیچے سوکھی پتیاں گری ہوئی تھی۔ بکری پتیوں پر ٹوٹی پڑتی تھی، گویا مہینوں کی بھوکی ہو۔ ابھی اس درخت کے نیچے تھی۔ ایک پل میں وہ دوسرے درخت کے نیچے جا پہنچی۔ میری دلیل ہو رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔ دفتر سے لوٹ کر ذرا آرام کیا کرتا تھا، آج یہ قواعد کرنا

پڑی، تھک گیا۔ مگر محنت سپھل ہوگئی۔ آج بکری نے کچھ زیادہ دودھ دیا۔

یہ خیال آیا اگر سوکھی پتیاں کھانے سے دودھ کی مقدار بڑھ گئی تو یقیناً ہری پتیاں کھلائی جائیں تو اس سے کہیں بہتر نتیجہ نکلے۔ لیکن ہری پتیاں آئیں کہاں سے؟ درختوں سے توڑوں تو باغ کا مالک ضرور اعتراض کرے گا۔ قیمتاً ہری پتیاں مل نہ سکتی تھیں۔ سوچا کیوں نہ ایک بار بانس کے لگّے سے پتیاں توڑیں۔ مالک نے شور مچایا تو اس سے منتیں کرلیں گے۔ راضی ہوگیا تو خیر، نہیں دیکھی جائے گی۔ تھوڑی سی پتیاں توڑ لینے سے درخت کا کیا بگڑا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک پڑوسی سے ایک پتلا لمبا بانس مانگ لایا۔ اس میں ایک انکس باندھا اور شام کو بکری کو ساتھ لے کر پتیاں توڑنے لگا۔ چور آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا تھا، کہیں مالک تو نہیں آرہا ہے۔ دفعتاً وہی کاچھی ایک طرف سے آنکلا اور مجھے پتیاں توڑتے دیکھ کر بولا: ''یہ کیا کرتے ہو بابو جی؟ آپ کے ہاتھ میں یہ لگّا اچھا نہیں لگتا۔ بکری پالنا ہم غریبوں کا کام ہے کہ آپ جیسے سریفوں کا۔'' میں کٹ گیا۔ کچھ جواب نہ سوجھا۔ اس میں کیا برائی ہے، اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے میں کیا شرم، وغیرہ جوابات ہلکے، بے حقیقت، مصنوعی معلوم ہوئے۔ سفید پوشانہ خودداری تے زبان بند کردی۔ کاچھی نے قریب آکر میرے ہاتھ سے لگّا لے لیا اور آن واحد میں پتیوں کا ڈھیر لگا دیا پوچھا: ''پتیاں کہاں رکھ آؤں؟''

میں نے جھینپتے ہوئے کہا: ''تم رہنے دو۔ میں اٹھا لے جاؤں گا۔''

اس نے تھوڑی سی پتیاں بغل میں اٹھالیں اور بولا: ''آپ کیا پتیاں رکھنے جائیں گے۔ چلیے میں رکھ آؤں۔''

میں نے برآمدے میں پتیاں رکھوادیں۔ اسی درخت کے نیچے اس کی چوگنی پتیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کاچھی نے ان کا ایک گٹھا بنایا اور سر پر لاد کر چلا گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ دہقان کتنے چالاک ہوتے ہیں۔ کوئی بات مطلب سے خالی نہیں۔

مگر دوسرے دن بکری کو باغ میں لے جانا میرے لیے دشوار ہوگیا۔ کاچھی پھر دیکھے گا اور نہ جانے کیا کیا فقرے چُست کرے۔ اس کی نظروں میں گر جانا، روسیاہ ہوجانے سے کم شرمسار نہ تھا۔ ہماری عزت اور توقیر کا جو معیار عوام نے قائم کر رکھا ہے، ہم کو اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ نکّو بن کر رہے تو کیا رہے۔

لیکن بکری اتنی آسانی سے آزاد نہ چہل قدمی سے دست بردار ہونا نہ چاہتی تھی جسے اس نے اپنا معمول سمجھنا شروع کردیا تھا۔ شام ہوتے ہی اس نے اتنے زور وشور سے صدائے احتجاج بلند کی کہ گھر میں بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ گنگری دار میں میں کی پیہم آوازیں آ آ کر کان کے پردوں کو مجروح کرنے لگیں۔ کہاں بھاگ جاؤں؟ بیوی نے اسے گالیاں دینا شروع کیں۔ میں نے غصے میں آکر کئی ڈنڈے رسید کیے مگر اس نے ستیاگرہ ملتوی کرنا تھا نہ کیا۔ عجیب عذاب میں جان تھی۔

آخر مجبور ہو گیا۔ ''خود کردہ را علاجے نیست''۔ آٹھ بجے رات، جاڑوں کے دن، گھر سے منہ نکالنا مشکل اور میں بکری کو باغ میں ٹہلا رہا اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ اندھیرے میں پانو رکھتے میری روح کانپتی ہے۔ ایک بار میرے سامنے سے ایک سانپ نکل گیا تھا۔ اگر اس کے اوپر پیر پڑ جاتا تو ضرور کاٹ لیتا۔ تب سے میں اندھیرے میں کبھی نہ نکلتا تھا۔ مگر آج اس بکری کے کارن مجھے اس خطرے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ذرا بھی ہوا چلتی اور پتے کھڑکتے تو میری آنتیں سکڑ جاتیں اور پنڈلیاں کانپنے لگتیں۔ شاید اُس جنم میں میں بکری رہا ہوں گا اور یہ بکری میری آقا رہی ہوگی۔ وہی کفارہ اس زندگی میں ادا کر رہا تھا۔ بُرا ہو اس پنڈت کا جس نے یہ بَلا میرے سر منڈھی۔ گرہستی ہی جنجال ہے۔ بچہ نہ ہوتا تو کیوں اس موذی جانور کی اتنی خوشامد کرنی پڑتی اور یہ بچہ بڑا ہو جائے گا تو بات نہ سنے گا۔ آپ نے میرے لیے کیا کیا ہے، کون سی جائیداد چھوڑی ہے۔ یہ سزا بھگت کر نو بجے رات کو لوٹا، اگر رات کو بکری مر جاتی تو مجھے مطلق غم نہ تھا۔

دوسرے دن صبح ہی سے مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کس طرح رات کی بیگار سے چھٹی ملے۔ آج دفتر میں تعطیل تھی۔ میں نے ایک لمبی سی رسّی منگوائی اور شام کو بکری کے گلے میں رسّی ڈالی۔ ایک درخت کی جڑ سے باندھ کر چھوڑ دیا۔ اب چَرے جتنا چاہے۔ اب چراغ جلتے جلتے کھول لاؤں گا۔ تعطیل تھی ہی۔ شام کو سنیما دیکھنے کی ٹھہری۔ ایک اچھا سا کھیل آیا ہوا تھا۔ نوکر کو بھی ساتھ لیا ورنہ بچے کو کون سنبھالتا۔ جب نو بجے رات کو گھر لوٹے اور میں لالٹین لے کر بکری لینے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے رسّی کو دو تین درختوں میں لپیٹ کر ایسا الجھا ڈالا ہے کہ سلجھنا مشکل ہے۔ اتنی رسّی بھی نہ بچی کہ وہ ایک قدم بھی چل سکتی، لاحول ولاقوۃ۔ جی میں آیا کمبخت کو یہیں چھوڑ دوں۔ مرتی ہے تو مر جائے۔ اب اتنی رات کو لالٹین کی روشنی سے کون رسّی سلجھانے بیٹھے۔ لیکن دل نہ مانا۔ پہلے اس کی گردن سے رسّی کھولی۔ پھر اس کی پیچ در پیچ اینٹھن چھڑائی، ایک گھنٹہ وقت صرف ہو گیا۔ مارے سردی کے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے اور جی جل رہا تھا وہ الگ۔ یہ ترکیب اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔

اب کیا کروں! کچھ عقل کام نہ کرتی تھی۔ دودھ کا خیال نہ ہوتا تو کسی کو مفت دے دیتا۔ شام ہوتے ہی چڑیل اپنی صدائے بے ہنگام شروع کر دے گی اور گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا اور آواز بھی کتنی کریہہ اور منحوس ہوتی ہے۔ شاستروں میں لکھا بھی ہے جتنی دور اس کی آواز جاتی ہے اتنی دور دیوتا نہیں آتے۔ سورگ کی بسنے والی ہستیاں جو اپسراؤں کے نغمے سننے کی عادی ہیں اس کی مکروہ آواز سے نفرت کریں تو کیا تعجب! مجھ پر اس کی سمع خراش صداؤں کی ایسی ہیبت سوار تھی کہ دوسرے دن دفتر سے آتے ہی میں گھر سے نکل بھاگا۔ لیکن ایک میل نکل جانے پر بھی ایسا گمان ہو رہا تھا کہ اس کی آواز میرا پیچھا کیے چلی آتی ہے۔ اپنی تنگ ظرفی پر شرم بھی آ رہی تھی۔ جسے ایک بکری رکھنے کی بھی توفیق نہ ہو، وہ اتنا نازک دماغ کیوں بنے۔ اور پھر تم ساری رات تو گھر سے باہر رہو گے نہیں، آٹھ بجے پہنچو گے تو کیا وہ گوسفندانہ نغمہ تمھارا خیر مقدم نہ کرے گا۔

دفعتاً ایک نیچی شاخوں والا درخت دیکھ کر مجھے بے اختیار اس پر چڑھنے کی تحریک ہوئی۔ سپاٹ تنوں پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے، یہاں تو ۶، ۷ فٹ کی اونچائی پر شاخیں پھوٹ گئیں تھیں، ہری ہری پتیوں سے درخت لدا کھڑا تھا۔ اور درخت بھی تھا گولر کا، جس کی پتیوں سے بکریوں کو خاص رغبت ہے۔ میں اِدھر تیس سال سے کسی روکھ پر نہیں چڑھا، وہ عادت جاتی رہی۔ اس لیے آسان چڑھائی کے باوجود میرے پانو کانپ رہے تھے، پر میں نے ہمت نہ ہاری اور پتیاں توڑ توڑ کر نیچے گرانے لگا۔ یہاں اکیلے میں کون مجھے دیکھتا ہے کہ پتیاں توڑ رہا ہوں۔ ابھی اندھیرا ہوا جاتا ہے۔ پتیوں کا ایک گٹھر بغل میں دباؤں گا اور گھر جا پہنچوں گا۔ اگر اتنے پر بھی بکری نے کچھ چیں چپڑ کی تو اس کی شامت ہی آجائے گی۔

میں ابھی اوپر ہی تھا کہ بکریوں اور بھیڑوں کا ایک غول نہ جانے کدھر سے آنکلا اور پتیوں پر پل پڑا۔ میں اوپر سے چیخ رہا ہوں، مگر کون سنتا ہے۔ چرواہے کا کہیں پتا نہیں۔ کہیں دبک رہا ہوگا کہ کہیں دیکھ لیا جاؤں گا تو گالیاں پڑیں گی۔ جھلا کر نیچے اترنے لگا۔ ایک ایک پل میں پتیاں غائب ہوتی جاتی تھیں۔ اتر کر ایک ایک کی ٹانگ توڑ دوں گا۔

یکا یک پانو پھسلا اور میں دس فٹ کی اونچائی سے نیچے آرہا۔ کمر میں ایسی چوٹ آئی کہ پانچ منٹ تک آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ خیریت ہوئی کہ اور اوپر سے نہیں گرا، نہیں تو یہیں شہید ہو جاتا۔ بارے میرے گرنے کے دھماکے سے بکریاں بھاگیں اور تھوڑی سی پتیاں بچ رہیں۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو میں نے ان پتیوں کو جمع کر کے ایک گٹھا بنایا اور مجبوروں کی طرح اسے کندھے پر رکھ کر شرم کی طرح چھپائے گھر چلا۔ راستے میں کوئی حادثہ نہ ہوا۔ جب مکان کوئی چار فرلانگ رہ گیا اور میں نے قدم تیز کیے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے تو وہ کاچھی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ کچھ نہ پوچھو اس وقت میری کیا حالت ہوگی۔ راستے کے دونوں طرف کھیتوں کی اونچی مینڈیں تھیں جن کے اوپر ناگ پھنی کے کانٹے لگے ہوئے تھے۔ اگر رستے رستے جاتا ہوں وہ ظالم میری بغل سے ہو کر گزرے گا اور خدا معلوم کیا ستم ڈھائے۔ کہیں مڑنے کا راستہ نہیں اور وہ مردود بلائے بے درماں کی طرح چلا آتا تھا۔ میں نے دھوتی اوپر سرکائی، چال بدل لی اور سر جھکا کر اس طرح نکل جانا چاہتا تھا کہ کوئی مزدور ہے۔ تلے کی سانس تلے تھی، اوپر کی اوپر جیسے وہ کاچھی کوئی خوں خوار شیر ہو۔ بار بار خدا کو یاد کر رہا تھا: ''یا الٰہی! تو ہی آفت زدوں کا والی و مددگار ہے۔ اس مردود کی زبان بند کر دے۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں کا نور غائب کر دے...'' آہ وہ جاں گسل لمحہ جب میں اس کے برابر ایک گز کے فاصلے سے نکلا۔ ایک ایک قدم تلوار کی دھار پر تھا کہ شیطانی آواز کان میں آئی:

''کون ہے رے؟ کہاں سے پتیاں توڑے لاتا ہے؟''

مجھے معلوم ہوا کہ نیچے کی زمین نکل گئی ہے اور میں اس کے گہرے شکم میں جا پہنچا ہوں۔ روئیں برچھیاں بنے ہوئے تھے، دماغ میں ابال سا آرہا تھا، اعضا مفلوج ہو رہے تھے۔ جواب دینے کا

ہوش نہ رہا۔ تیزی سے دو تین قدم آگے بڑھ گیا۔ مگر وہ ارادی فعل نہ تھا، حفظ جان کا اضطراری عمل تھا۔ ایک ظالم ہاتھ گٹھے پر پڑا اور گٹھا نیچے گر پڑا۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے دروازے پر پسینے میں تر کھڑا تھا۔ گویا مرگی کے دورے کے بعد اٹھا ہوں۔ اس وقفے میں روح پر شعور ثانی کی حکومت تھی اور بکری کی وہ مکروہ آواز، وہ دلخراش آواز، وہ ہمت شکن آواز، وہ ساری دنیا کی نحوستوں کا خلاصہ، وہ دنیا کی ساری لعنتوں کی روح، کان میں چبھی جا رہی تھی۔

بیوی نے پوچھا: ''آج کہاں چلے گئے تھے؟ اس چڑیل کو ذرا باغ میں بھی نہ لے گئے۔ جینا محال کیے دیتی ہے۔ گھر سے نکل کر کہاں چلی جاؤں؟''

میں نے تشفی دی: ''آج چلانے دو۔ کل سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اسے گھر سے نکال باہر کروں چاہے قصاب ہی کو دینا پڑے۔''

''اور لوگ نہ جانے کیسے بکری پالتے ہیں۔''

''بکریاں پالنے کے لیے کتے کا دماغ چاہیے۔''

صبح کو بستر سے اٹھ کر اسی فکر میں بیٹھا تھا کہ اس کالی بلا سے کیوں کر نجات حاصل کروں کہ دفعتاً ایک گڈریہ بکریوں کا ایک گلہ چراتا ہوا آنکلا۔ میں نے اسے پکارا اور اس سے اپنی بکری کو چرانے کی تجویز پیش کی۔ گڈریہ راضی ہو گیا۔ یہی اس کا کام تھا۔

میں نے پوچھا: ''کیا لو گے؟''

''آٹھ آنے بکری ملتے ہیں، ہجور۔''

''میں ایک روپیا دوں گا۔ لیکن بکری میرے سامنے نہ آئے۔''

گڈریہ حیرت میں پڑ گیا: ''مرکھنی ہے کیا، بابو جی؟''

''نہیں نہیں۔ بہت سیدھی ہے۔ بکری کیا مارے گی۔ لیکن میں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''ابھی دودھ تو دیتی ہے۔''

''ہاں سیر سوا سیر دودھ دیتی ہے۔''

دودھ آپ کے گھر میں پہنچ جایا کرے گا۔''

''تمھاری مہربانی۔''

جس وقت بکری گھر سے نکلی ہے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری نحوست نکلی جا رہی ہے۔ بکری بھی خوش تھی گویا قید سے چھوٹی ہو۔

گڈریے نے اسی وقت دودھ نکالا اور گھر میں رکھ کر بکری کو لیے چلا گیا۔ ایسا بے غرض گاہک اسے زندگی میں شاید پہلی ہی بار ملا ہو گا۔

ایک ہفتے تک تو دودھ تھوڑا بہت آتا رہا۔ پھر اس کی مقدار کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک

مہینا ختم ہوتے ہوتے دودھ بالکل ختم ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ بکری گابھن ہوگئی ہے۔ میں نے ذرا بھی اعتراض نہ کیا۔ کاچھی کے پاس گائے تھی۔ اس سے دودھ لینے لگا۔ میرا نوکر خود جا کر دہالاتا تھا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ گڈریا مہینے میں ایک بار آ کر اپنا روپیا لے جاتا۔ میں نے کبھی اس سے بکری کا ذکر نہ کیا۔ اس کے خیال ہی سے میری روح کو وحشت ہوتی ہے۔ اگر قیافہ شناس ہوتا تو بڑی آسانی سے اپنا حق الخدمت دوگنا کر سکتا تھا۔

ایک دن میں دروازے پر بیٹھا ہوا تھا کہ گڈریہ اپنی بکریوں کا گلہ لیے آنکلا۔ میں اس کا روپیا لانے اندر گیا کہ کیا دیکھتا ہوں میری بکری دو بچوں کے ساتھ مکان میں آ پہنچی۔ وہ پہلے سیدھی اس جگہ گئی جہاں بندھا کرتی تھی۔ پھر وہاں سے آنگن میں آئی اور شاید تعارف کے اظہار کے لیے میری طرف تاکنے لگی۔ انھوں نے دوڑ کر ایک بچے کو گود میں لے لیا اور کوٹھری میں جا کر مہینوں کا جمع چوکر لائیں اور ایسی محبت سے بکری کو کھلانے لگیں گویا بہت دنوں کی بچھڑی ہوئی سہیلی آ گئی ہو۔ نہ وہ پرانی تلخی تھی، نہ وہ کدورت۔ کبھی بچے کو چمکارتی تھیں، کبھی بکری کو سہلاتی تھیں اور بکری ڈاک کی رفتار سے چوکر اڑا رہی تھی۔

تب مجھ سے بولیں: ''کتنے خوب صورت بچے ہیں۔''

''ہاں بہت خوب صورت۔''

''جی چاہتا ہے ایک پال لوں۔''

''ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی؟''

''تم بڑے نرموہے ہو۔''

چوکر ختم ہوگیا۔ بکری اطمینان سے رخصت ہوگئی۔ دونوں بچے بھی اس کے پیچھے پھدکتے ہوئے چلے گئے۔ دیوی جی آنکھوں میں آنسو بھرے یہ تماشا دیکھتی رہیں۔

گڈریے نے چلم بھری اور گھر میں آگ مانگنے آیا۔ چلتے وقت بولا: ''کل سے دودھ پہنچا دیا کروں گا، مالک۔''

دیوی نے کہا: ''اور دونوں بچے کیا پئیں گے؟''

''بچے کہاں تک پئیں گے بہو جی! دو سیر دودھ دیتی ہے۔ اجی دودھ اچھا نہ ہوتا تھا اس مارے نہیں لایا۔''

مجھے رات کا وہ روح شکن واقعہ یاد آ گیا۔

میں نے کہا: ''دودھ لاؤ یا نہ لاؤ تمھاری خوشی، لیکن بکری کو اِدھر نہ لانا۔''

اس دن سے وہ گڈریہ نظر آیا اور نہ وہ بکری۔ اور نہ میں نے سراغ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن دیوی جی اس کے بچوں کو یاد کر کے کبھی کبھی آنسو بہا لیتی ہیں۔

☆☆☆

مفت کرم داشتن

ان دنوں حسنِ اتفاق سے حاکم ضلع ایک صاحب ذوق بزرگ تھے جنھوں نے تاریخ اور قدیم سکہ جات میں اچھی تفتیش کی ہے۔ خدا جانے کیسے دفتری کاموں سے انہیں ان مشاغل کے لیے فرصت مل جاتی ہے۔ میں نے ان کے کارنامے پڑھے تھے اور ان کا غائبانہ مدّاح تھا لیکن ان کی افسری مزید تعلقات میں مانع تھی۔ مجھے یہ تکلف تھا کہ اگر میری جانب سے پیش قدمی ہوئی تو عام تجربے کے مطابق وہ میری حکّام جوئی پر محمول کی جائے گی اور میں کسی حالت میں بھی یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں تو حکّام کو دعوتوں اور عام تقریبوں میں بھی مدعو کرنے کا مخالف ہوں اور جب کبھی سنتا ہوں کسی افسر کو کسی رفاہ عام کے جلسے کا صدر بنایا گیا یا کوئی اسکول یا شفاخانہ یا بدھوا آشرم کسی گورنر کے نام سے منسوب ہوا تو برادرانِ وطن کی غلامانہ ذہنیت پر گھنٹوں افسوس کرتا ہوں۔ مگر جب ایک دن حاکمِ ضلع نے خود میرے نام ایک رقعہ بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کیا آپ میرے بنگلے پر تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے تو میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا، کیا جواب دوں؟ اپنے دو ایک دوستوں سے مشورہ لیا۔ انہوں نے کہا صاف کہہ دیجیے مجھے فرصت نہیں، وہ حاکمِ ضلع ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے، کوئی سرکاری یا ضابطے کا کام ہوتا تو آپ کا جانا مناسب تھا۔ لیکن ذاتی ملاقات کے لیے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آخر وہ خود آپ کے مکان پر کیوں نہیں آئے۔ اس سے کیا ان کی شان میں بٹہ لگا جاتا تھا، اسی لیے تو خود نہیں آئے اور آپ کو بلایا کہ وہ حاکمِ ضلع ہیں۔ ان احمق ہندستانیوں کو بھی یہ سمجھ نہ آئے گی کہ دفتر کے باہر وہ بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم یا آپ۔ شاید یہ لوگ اپنی بیوی سے بھی افسری جتاتے ہوں گے۔ انہیں اپنا عہدہ کبھی نہیں بھولتا۔

ایک صاحب نے جو لطیفوں کے خزانچی ہیں ہندستانی افسروں کے کئی پُر مذاق تذکرے سنائے۔ ''ایک افسر صاحب سسرال گئے، شاید بیوی کو رخصت کرانا تھا جیسا عام رواج ہے۔ خسر صاحب نے اس موقع پر رخصت کرنے سے انکار کیا۔ کہا: ''بیٹا! ابھی اتنے دنوں کے بعد آئی ہے تین مہینے بھی نہیں ہوئے۔ بھلا اور نہیں تو چھے مہینے تو رہنے دو۔'' ادھر بیوی نے بھی نائن کے ذریعے پیغام کہلا بھیجا: ''ابھی میں جانا نہیں چاہتی۔ آخر ماں باپ سے مجھے بھی تو محبت ہے۔ کچھ تمھارے ہاتھ بک

تھوڑی ہی گئی ہوں۔'' میاں داماد ڈپٹی کلکٹر تھے، جامے سے باہر ہو گئے۔ خسر پر سمن جاری کر دیا۔ بیچارا بڈھا آدمی دوسرے دن صاحب زادی کو لے کر داماد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تب جا کے اس کی جان بچی۔ یہ لوگ ایسے خرد ماغ ہوتے ہیں، اور پھر تمھیں حاکمِ ضلع سے لینا کیا ہے، اگر تم کوئی باغیانہ یا اشتعال انگیز قصہ یا مضمون لکھو گے تو فوراً گرفتار ہو جاؤ گے۔ مطلق رعایت نہ کی جائے گی۔ اپنے لڑکے کے لیے قانون گوئی، نائب تحصیل داری کی فکر تمھیں ہے نہیں۔ پھر خواہ مخواہ کیوں دوڑے جاؤ۔''

لیکن میں نے دوستوں کی صلاح پر کار پیرا ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا۔ ایک شریف آدمی قدر افزائی کرتا ہے تو اس سے محض اس بنا پر بے اعتنائی کرنا کہ وہ حاکم ضلع ہے تنگ ظرفی ہے۔ بے شک حاکم ضلع صاحب میرے غریب خانے پر آتے تو ان کی شان کم نہ ہوتی۔ وضع دار آدمی بے تکلف چلا آتا۔ لیکن بھئی ضلع کی افسری بڑی چیز ہے اور قصہ نگار کی ہستی ہی کیا ہے۔ انگلینڈ یا امریکہ میں افسانہ نگاروں کی میز پر مدعو ہونے میں وزیر اعظم بھی اپنا اعزاز سمجھتے ہوں گے، لیکن یہ ہندستان ہے جہاں ہر ایک رئیس کے دربار میں شاعروں کا ایک انبوہ قصیدہ خوانی کے لیے جمع رہتا تھا۔ اور اب بھی تاجپوشی کے موقع پر ہمارے اہلِ قلم بن بلائے رئیسوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ قصیدہ پیش کرتے ہیں۔ انعام پاتے ہیں، تو تم ایسے کہاں کے ہو کہ حاکم ضلع تمھارے گھر پر چلا آئے۔ وہ افسر ہے تم مضمون نگار ہو۔ جب تم میں اس قدر لڑکپن اور تنگ مزاجی ہے تو پھر وہ تو ضلع کا بادشاہ ہے، اگر اسے غرور بھی ہو تو جائز ہے۔ کمزوری کہو، جہالت کہو، خرد ماغی کہو، لیکن پھر بھی جائز ہے اور خدا کا شکر کرو کہ افسر صاحب تمھارے گھر نہیں آئے، ورنہ ان کی خاطر و مدارات کا سامان تمھارے یہاں کہاں تھا؟ گت کی ایک کرسی بھی تو نہیں ہے۔ تین پیسے کی چوبیس بیڑیاں پی کر دل خوش کر لیتے ہو، ہے توفیق روپے کی دو سگار پینے کی؟ کہاں وہ سگار ملتا ہے، اس کا کیا نام ہے اس کی خبر ہے تمھیں؟ اپنی تقدیر کو سراہو کہ وہ خود نہیں آئے تمھیں بلا لیا۔ چار پانچ روپے بگڑ ہی جاتے اور شرمندگی بھی ہوتی۔ خدانخواستہ اور تمھاری شامت اعمال سے کہیں ان کی اہلیہ بھی ہمراہ ہوتیں تو قیامت ہی آ جاتی۔ ان کی مہمان نوازی تم یا تمھاری دھرم پتنی جی کر سکتی تھیں؟ وہ تمھارے گھر میں یقیناً جاتیں اور تمھارے لیے موت کا سامان ہوتا۔ تم اپنے گھر میں پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اپنی بے نوائی میں مگن رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہو لیکن کوئی بھی خوددار شخص یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی خستہ حالی دوسروں کے لیے مایۂ تفریح ہو۔ ان لیڈی صاحبہ کے سامنے تمھاری تو زبان بند ہو جاتی اور یہی جی چاہتا کہ زمین پھٹ جاتی اور تم اس میں سما جاتے۔

چنانچہ میں نے حاکم ضلع کی دعوت قبول کی اور باوجودیکہ اس میں کسی قدر ناگوار رعونت تھی لیکن شفقت اور خلوص نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔ کم سے کم انہوں نے مجھے شکایت کا موقع نہ دیا۔ افسرانہ فطرت کو تبدیل کرنا ان کے امکان سے باہر تھا۔

میں نے سوچا یہ ذاتی معاملہ ہے۔ انہوں نے مجھے بلایا میں چلا گیا۔ کچھ ادبی گپ شپ کی اور واپس آیا۔ کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے اس واقعہ کو ذرا اہمیت نہ دی۔ گویا بازار سبزی خریدنے گیا تھا۔

لیکن مخبروں نے نہ جانے کیسے اس کی خبر لگالی۔ خاص خاص حلقوں میں یہ چرچے ہونے لگے کہ افسر ضلع سے میرے بہت دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ مبالغے نے میری وقعت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ یہاں تک مشہور ہوا کہ وہ مجھ سے صلاح لیے بغیر کوئی تجویز یا رپورٹ نہیں لکھتے۔

کوئی ذی ہوش آدمی اس قسم کی شہرت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اہل غرض باؤلے ہوتے ہیں، تنکے کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انہیں اس کا یقین دلانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ میرے ذریعے ان کی مطلب براری ہو سکتی ہے لیکن میں ایسی حرکتوں کو ذلیل سمجھتا ہوں۔ صدہا اصحاب اپنی اپنی داستانیں لے کر میرے پاس آئے۔ کسی کے ساتھ پولیس نے بے جا زیادتی کی تھی، کوئی انکم ٹیکس والوں کی سختی سے نالاں تھا۔ کسی کو یہ شکایت تھی کہ دفتر میں اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور اس کے بعد کے آدمیوں کو ترقیاں مل رہی ہیں۔ اس کا نمبر جب آتا ہے کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہذا اس قسم کی کوئی داستان روز ہی مجھ تک پہنچنے لگی۔ لیکن میرے پاس ان سب کے لیے ایک ہی جواب تھا۔ ''مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔''

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میرے بچپن کے ایک ہم جماعت دوست وارد ہوئے۔ ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ کوئی ۴۵ سال کی پرانی بات ہے۔ میری عمر ۸، ۹ سال سے زیادہ نہ تھی، وہ بھی قریب قریب اسی عمر کے مگر مجھ سے کہیں توانا اور فربہ تھے۔ میں ذہین تھا، وہ حد درجہ کے غبی۔ مولوی صاحب ان سے عاجز تھے اور انھیں سبق پڑھانے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی تھی۔ میں اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا اور مولوی صاحب کی تحکمی جہاں لاچار تھی وہاں میری ہمدردی کامیاب ہوگئی۔ بلدیو چل نکلا اور خالق باری تک آ پہنچا۔ مگر اسی درمیان میں مولوی صاحب کی وفات نے اس مکتب کا خاتمہ کر دیا اور طلبہ بھی منتشر ہو گئے۔ تب سے بلدیو کو میں نے صرف دو تین بار رات میں دیکھا (میں اب بھی وہی منحنی ہوں، وہ اب بھی دیو قامت) رام رام ہوئی۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی اور اپنی اپنی راہ چلے، میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ''آؤ بھئی بلدیو، مزے میں تو ہو۔ کیسے یاد کیا، کیا کرتے ہو آج کل؟''

بلدیو نے دردناک انداز سے کہا: ''زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور کیا۔ تم سے ملنے کا بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ یاد کرو وہ مکتب والی بات جب تم مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ تمھاری بدولت چار حرف پڑھ لیا اور اپنی زمینداری کا کام سنبھال لیتا ہوں، نہیں مورکھ بنا رہتا۔ تم میرے گرو ہو بھائی۔ سچ کہتا ہوں مجھ جیسے گدھے کو پڑھانا تمھارا ہی کام تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مولوی صاحب سے سبق

پڑھ کر اپنی جگہ پر آیا نہیں کہ بالکل صاف، کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ تم تو تب بھی بڑے ذہین تھے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے پُرعزت نظروں نے دیکھا۔ میں نے با چشم تر کہا: ''میں تو جب تمھیں دیکھتا ہوں تو یہی جی میں آتا ہے کہ دوڑ کر تمھارے گلے سے لپٹ جاؤں۔ ۴۵ سال کی مدت گویا بالکل غائب ہو جاتی ہے، وہ مکتب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور بچپن ساری دلفریبیوں کے ساتھ تازہ ہو جاتا ہے۔''

بلدیو نے بھی رقّت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے تو بھئی تمھیں ہمیشہ اپنا مربّی اور رہنما سمجھا ہے۔ جب تمھیں دیکھتا ہوں تو چھاتی گز بھر کی ہو جاتی ہے کہ وہ میرا بچپن کا دوست جاتا ہے جو وقت پڑنے پر کبھی دغا نہ دے گا۔ تم کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں، سوکھتے کیوں جاتے ہو، گھی نہ ملتا ہو تو ایک دو کنستر بھجوا دوں۔ اب تم بوڑھے ہوئے، خوب ڈٹ کر کھایا کرو۔ اب تو بدن میں جو کچھ طاقت ہے وہ کھانے پینے کی بدولت ہے۔ میں تو اب بھی سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر گھی اڑا جاتا ہوں۔ ادھر تھوڑا مکھن بھی کھانے لگا ہوں۔ عمر بھر بال بچوں کے لیے مرمٹے۔ کوئی پوچھتا ہے تمھاری کیا حالت ہے؟ اگر آج کندھا ڈال دوں تو کوئی ایک لوٹا پانی کو نہ پوچھے۔ اس لیے خوب کھاتا ہوں اور سب سے زیادہ کام کرتا ہوں۔ وہی جو بڑا لڑکا ہے اس پر پولیس نے ایک جھوٹا مقدمہ چلا دیا ہے۔ اچھا خاصا پہلوان ہے۔ کسی سے دبتا نہیں۔ داروغہ جی سے ایک بار کچھ کہا سنی ہو گئی تب سے اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ ادھر گانو میں ایک ڈاکہ پڑ گیا، داروغہ جی نے تحقیقات میں اسے بھی پھانس لیا۔ ایک ہفتے سے حراست میں ہے۔ مقدمہ محمد خلیل صاحب ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں ہے اور محمد خلیل اور داروغہ کی گہری دوستی ہے، ضرور سزا ہو جائے گی۔ اب تم ہی بچاؤ تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔ ہمیں اور کوئی امید نہیں ہے۔ سزا تو ہوگی ہی عزت خاک میں مل جائے گی۔ تم جا کر حاکم ضلع سے اتنا کہہ دو کہ مقدمہ جھوٹا ہے۔ آپ خود تحقیقات کریں۔ بس دیکھو بچپن کے ساتھی ہو، انکار مت کرنا۔ جانتا ہوں کہ تم ان معاملات میں نہیں پڑتے اور نہ پڑنا چاہیے۔ افسر ضلع سے تمھاری دوسری طرح کی ملاقات ہے۔ تم کیوں ان قضیوں میں پڑو گے، لیکن یہ گھر کا معاملہ ہے۔ اتنا سمجھ لو اور بالکل جھوٹا ہے، نہیں میں تمھارے پاس نہیں آتا۔ لڑکے کی ماں رو رو کر جان دیے ڈالتی ہے۔ بیوی نے دانہ پانی چھوڑ رکھا ہے۔ سات دن سے گھر میں چولھا نہیں جلا۔ میں دودھ پی لیتا ہوں۔ لیکن دونوں ساس بہو بے آب و دانہ پڑی ہوئی ہیں۔ اگر سزا ہوئی تو دونوں مر جائیں گی۔ میں نے یہی کہہ کر سب کو ڈھارس دی ہے کہ جب تک ہمارا بچپن کا دوست زندہ ہے، کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''

میں بڑی مشکل میں پڑا۔ میری جانب سے جتنے اعتراضات ہو سکتے تھے ان کا جواب بلدیو سنگھ نے پہلے ہی دے دیا تھا۔ اگر ان کا اعادہ کرتا ہوں تو سر ہو جائے گا۔ گلا نہ چھوڑے گا۔ کوئی

جواب نہ سوجھا۔ آخر مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ میں جا کر صاحب سے اس کا ذکر کروں گا۔ مگر مجھے امید نہیں کہ اس کا کچھ نتیجہ ہو۔ حکام ماتحتوں کے معاملے میں بہت کم دخل دیا کرتے ہیں۔

''تم جا کر کہہ دو۔ تقدیر میں جو ہے وہ تو ہوگا ہی۔''

''اچھی بات ہے۔''

''تو کل جاؤ گے۔''

''کل ہی جاؤں گا۔''

بلدیو سنگھ کو رخصت کر کے میں نے اپنا مضمون ختم کیا اور آرام سے کھانا کھا کر لیٹا۔ میں نے بلدیو سنگھ کو جھانسا دیا تھا۔ میں پہلے سے بتا چکا تھا کہ عام طور سے پولیس کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی کافی گنجایش تھی کہ صاحب نے اس معاملے میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ صاحب کے پاس جانے کا میں نے خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا۔

میں اس واقعہ کو بالکل بھول گیا تھا کہ آٹھویں دن بلدیو سنگھ اپنے پہلوان بیٹے کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ بیٹے نے میرے قدموں پر سر رکھ دیا اور ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ بلدیو سنگھ بولے: ''بالکل بَری ہو گیا۔ بھائی صاحب نے داروغہ جی کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ تم بھلے آدمیوں کو ستاتے اور بدنام کرتے ہو۔ اگر پھر ایسی شرارت کی تو برخاست کر دیے جاؤ گے۔ داروغہ بہت پریشان ہوئے۔ جب صاحب نے اسے بری کر دیا تو میں نے داروغہ صاحب کو جھک کر سلام کیا۔ بچارے پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یہ تمھاری سفارش کی برکت ہے برادر۔ اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو چار آدمیوں کی جان بچ گئی۔ میں تمھارے پاس ڈرتے ڈرتے آیا تھا۔ لوگوں نے کہا تھا کہ ان کے پاس ناحق جاتے ہو۔ وہ بڑا بے مروت آدمی ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ آدمی وہ کہلاتا ہے جس سے ضرورت مندوں کا کام نکلے۔ وہ کیا آدمی ہے جو کسی کی کچھ سنے ہی نہیں۔ یہی کہے مجھ سے کچھ مطلب نہیں۔ لیکن بھائی، میں نے کسی کی نہ سنی۔ میرے دل میں میرا رام بیٹھا کہہ رہا ہے تم چاہے کتنے ہی روکھے، بے مروت ہو لیکن مجھ پر ضرور رحم کرو گے۔''

یہ کہہ کر بلدیو سنگھ نے اپنے لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ باہر گیا اور ایک بڑا سا گٹھر اٹھا لایا جس میں انواع و اقسام کی دیہاتی سوغاتیں بندھی ہوئی تھیں۔ حالانکہ میں برابر کہے جاتا تھا: ''کوئی ضرورت نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔''

مگر اس وقت بھی مجھے یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ میں صاحب کے پاس گیا ہی نہیں۔ جو کچھ ہوا خود بخود ہوا۔ مفت کا احسان چھوڑ نا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

☆☆☆

قاتل کی ماں

(۱)

رات کو رامیشوری سوئی تو کیا خواب دیکھتی ہے کہ ونود نے کسی آفیسر کو مار ڈالا ہے اور کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں بے گناہوں کو زدوکوب کر رہی ہے اور تمام شہر میں شور وشر بپا ہے۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو ونود سو رہا تھا۔ اٹھ کر ونود کے پاس گئی۔ پیار سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور سوچنے لگی میں نے کیا بے سر پیر کا خواب دیکھا۔ اس کے ساتھ کچھ متفکر بھی ہو گئی پھر لیٹی۔ مگر نیند نہ آئی۔ دل میں ایک خوف سما گیا تھا۔

صبح کو ونود نے ماں کو متفکر دیکھ کر پوچھا: ''اماں آج اداس کیوں ہو؟''

ماں ونود کو محبت سے لبریز آنکھوں سے دیکھ کر بولی: ''بیٹا! تم سے کیا کہوں، رات کو میں نے ایک بہت برا خواب دیکھا ہے، جیسے تم کسی افسر کو مار کر بھاگ گئے ہو اور بے گناہوں پر مار پڑ رہی ہے۔''

ونود نے ہنس کر کہا: ''کیا تم چاہتی تھیں کہ میں پکڑ لیا جاتا؟''

ماں نے کہا: ''میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایسے کاموں کے نزدیک ہی نہ جاؤ۔ پکڑے جانے کا سوال ہی کیوں اٹھے۔ ہمارا دھرم ہے کہ خود جییں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ دوسروں کو مار کر خود جینا میرے دھرم کے خلاف ہے۔''

ونود: ''دھرم اور نیتی کا زمانہ نہیں ہے۔''

ماں: ''دھرم اور نیتی کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے اور آیندہ بھی ہوگی۔ سوراجیہ قتل، خون سے نہیں ملتا۔ تیاگ، تپ اور آتم شُد ہی سے ملتا ہے۔ لالچ چھوڑتے نہیں، بُری خواہشات چھوڑتے نہیں، اپنی برائیاں دیکھتے نہیں۔ اس پر دعوا ہے سوراجیہ لینے کا! یہ سمجھ لو جو سوراجیہ قتل وخون سے ملے گا، وہ ملک کی چیز نہ ہوگی۔ افراد کی چیز ہوگی اور تھوڑے سے آدمیوں کا ایک گروہ تلوار کے زور سے انتظام کرے گا۔ ہم عوام کا سوراجیہ چاہتے ہیں، قتل وخون کی طاقت رکھنے والے گروہ کا نہیں۔''

ونود نے کہا: ''تم تو اسٹیج پر کھڑی ہو کر بولتی ہو۔ یہاں کون سننے والا ہے۔''

ماں نے کہا: ''بیٹا! تم ہنستے ہو اور میرا جی دکھی ہے۔ کئی دن سے دائیں آنکھ برابر پھڑک رہی ہے۔ یقیناً کوئی مصیبت آنے والی ہے۔''

ونود نے کہا: ''میں مصیبت سے نہیں ڈرتا۔ ابھی کون سا سکھ بھوگ رہی ہو جو مصیبتوں سے ڈریں۔''

یہ کہتا ہوا ونود باہر چلا گیا۔

(۲)

آج صبح سے ہی ونود کا پتہ نہ تھا۔ معلوم نہیں کہاں گیا۔ رامیشوری نے پہلے تو سمجھا کہ کانگریس کے دفتر میں ہوگا۔ لیکن جب ایک بج گیا اور وہ لوٹ کر نہ آیا تو اسے فکر ہوئی۔ دس بجے کے بعد وہ کہیں نہ رکتا تھا۔ پھر سوچا شاید کسی کام سے چلا گیا ہو۔ رات کا خواب اسے بے چین و پریشان کرنے لگا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی بڑھنے لگی۔ جب شام ہوگئی تو اس سے نہ رہا گیا۔ کانگریس کے دفتر گئی۔

وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج ونود صبح سے ایک بار بھی نہ آیا۔

رامیشوری کا دل کسی نامعلوم خوف سے پریشان ہو گیا اور وہ خواب مجسم بن کر اسے ڈرانے لگا۔ کچھ دیر تک وہ حواس باختہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر خیال آیا شاید گھر گیا ہو۔ فوراً گھر لوٹی لیکن یہاں ونود کا اب تک پتا نہ تھا۔

جوں جوں اندھیرا ہوتا جاتا تھا اس کی جان خشک ہوتی جاتی تھی۔ اس پر دائیں آنکھ بھی پھڑکنے لگی۔ خیالات اور بھی خوف ناک صورت اختیار کرنے لگے۔ کوئی دیوی یا دیوتا نہ بچا جس کی اس نے منت نہ مانی ہو۔ کبھی صحن میں آکر بیٹھ جاتی۔ کبھی دروازے پر جا کر کھڑی ہوتی۔ اس کا دل کسی خوف زدہ طائر کی مانند کبھی نشیمن میں آبیٹھتا اور کبھی شاخ پر۔ کھانا پکانے کا خیال کسے تھا۔ بار بار یہی سوچتی: ''بھگوان میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے جس کی سزا دے رہے ہو۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کرو۔ میں تو خود ہی مصیبت زدہ ہوں، اب اور برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔''

رامیشوری سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بے کس کے ساتھ کوئی رونے والا نہ دیکھ کر اس کا ساتھ دیتی ہوں۔

(۳)

نصف شب گزر چکی تھی۔ رامیشوری ابھی تک دروازے پر کھڑی ونود کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کوئی شخص نہایت تیزی سے دوڑا ہوا آیا اور دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ کمبل تھا جسے اس نے اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ منہ کا بڑا حصہ چھپ گیا تھا۔

رامیشوری نے ڈر کر پوچھا: ''کون ہے؟''

وہ ونود تھا۔ جلدی سے اندر داخل ہو کر ماں سے دروازہ بند کرنے کو کہا، پھر آنگن میں آ کر کمبل کو رکھ دیا اور کھانے کو مانگا۔

رامیشوری نے خائف ہو کر پوچھا: ''تم آج دن بھر کہاں تھے؟ میں تمام دن تمھیں ڈھونڈتی رہی۔''

ونود نے قریب آ کر کہا: ''میں ایک نہایت ضروری کام سے گیا تھا اور ابھی پھر لوٹ جانا ہے۔ صرف تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اب دو چار مہینے میں یہاں نہ رہ سکوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے وہی کیا جو میں اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ حفاظت جان کی خاطر مجھے یہاں سے بھاگ جانا ضروری ہے۔''

رامیشوری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بولی: ''کیوں بیٹا! تم نے وہی کیا جس کا مجھے خوف تھا۔ ایشور نے تمھاری بدھی کیوں ہر لی؟''

ونود نے کہا: ''نہ ایشور نے میری بدھی ہری ہے، نہ مجھ پر کوئی آفت آئی ہے۔ میں نے آج چھاؤنی میں ایک آفیسر کو مار ڈالا ہے۔ ایسا نشانہ مارا ایک ہی گولی میں ٹھنڈا ہو گیا۔ ہلا تک نہیں۔''

''کیا وہاں کوئی اور نہ تھا؟''

''کوئی نہیں، بالکل سناٹا تھا۔''

''پولیس کو خبر تو ہو گئی ہو گی۔''

''ہاں کئی شخص پکڑے گئے ہیں۔ میں تو صاف بچ نکلا۔''

رامیشوری کی حالت بدل گئی۔ بیٹے کی محبت میں اشکبار آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ بولی: ''میں اسے بچنا نہیں کہتی۔ مجرم تو منہ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے۔ تم خونی ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری کوکھ سے ایسا سپوت پیدا ہو گا ورنہ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ اگر مرد ہے تو جا کر عدالت میں اپنا قصور تسلیم کر لے ورنہ ان بے گناہوں کا خون بھی تیرے سر پر ہو گا۔''

یہ پھٹکار سن کر ونود کو غصہ آ گیا۔ بولا: ''تمھارے کہنے سے میں خونی نہیں ہو جاتا۔ اور لوگ

یہی کام کرتے ہیں تو لیڈر ہو جاتے ہیں، ان کی جے کار ہوتی ہے، لوگ اُن کی پوجا کرتے ہیں۔ میں نے کیا تو ہتیارا ہو گیا۔''

رامیشوری: ہتیارا تو تو ہے ہی اور جو دوسروں کی ہتیا کرتے ہیں وہ تمام کے تمام ہتیارے ہیں۔ تیری ماں ہو کر میں بھی پاپ کی حصے دار ہو گئی۔ میرے منہ پر بھی سیاہی لگ گئی۔ لیڈر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے مرتے ہیں۔ جو دوسروں کی حفاظت کرے وہی بہادر اور سورما ہے۔ انھیں کا جنم مبارک ہے، انھیں کی مائیں خوش نصیب ہیں۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو خون کر کے اپنی بڑائی کر رہا ہے۔''

ونود نے پھر کمبل اٹھا لیا اور بولا: ''تم میری ماں نہ ہوتیں تو اسی وقت لگے ہاتھ تمھارا کام بھی تمام کر دیتا۔ جیتے جی پھر تمھارا منہ نہ دیکھوں گا۔''

یہ کہتا ہوا وہ جوش میں گھر سے نکل پڑا۔

(۴)

دم بھر بعد رامیشوری بھی اس جوش میں گھر سے نکلی: ''بیٹا ہے تو کیا، وہ یہ ناانصافی نہیں گوارا کر سکتی، وہ اسی وقت کوتوالی میں جا کر اس خون کی خبر دے دے گی۔ ونود کا پھانسی پر چڑھنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بے گناہوں کو پھانسی ہو۔''

لیکن کچھ دور چلنے کے بعد ماں کا دل بے چین ہو گیا۔ وہ لوٹ پڑی اور گھر آ کر خوب روئی۔ جس بیٹے کو اس نے ایسی ایسی مصیبتیں جھیل کر پالا، کیا اسے پھانسی دلا دے گی۔

لیکن پھر خیال آیا ان بیچاروں کی مائیں بھی تو ہوں گی جو بے گناہ پھانسی پائیں گے۔ انھیں بھی اپنے بیٹے اتنے ہی پیارے ہوں گے۔ نہیں نہیں وہ یہ ظلم نہیں کر سکتی۔ اسے بغیر بیٹے کے ہونا منظور ہے مگر اس کے دیکھتے بے گناہوں کا خون نہ ہوگا۔

رامیشوری اسی الجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ جب کوئی راستہ نہ نظر آتا تو وہ رونے لگ جاتی تھی۔ پھر سوچتی، کیوں نہ خودکشی کر لوں کہ تمام دکھوں سے نجات مل جائے۔ لیکن اس کی موت سے ان بے گناہوں کی جان تو نہ بچے گی۔ ان ماتاؤں کا کلیجہ تو نہ ٹھنڈا ہوگا۔ وہ اس پاپ سے تو نہ آزاد ہوں گے۔ وہ اپنے آپ ہی بول اٹھی: ''خواہ کچھ ہو میں بے گناہوں کا خون نہ ہونے دوں گی۔ اجلاس میں جا کر صاف صاف کہہ دوں گی کہ گنہ گار میں ہوں کیونکہ میرے بیٹے نے یہ خون کیا ہے۔ ہم دونوں ہی قصوروار ہیں۔ دونوں کو پھانسی دیجیے۔ میں اپنے دھرم سے منحرف نہ ہوں گی۔ خواہ میری آنکھوں کے سامنے ہی ونود کی بوٹی بوٹی کیوں نہ کر ڈالی جائے۔ ہاں! میں اپنی آنکھوں

سے اس کو پھانسی پر چڑھتا دیکھوں گی کیوں کہ میں نے اس کو جنم دیا ہے۔ بھگوان! مجھے طاقت دو کہ اپنے فرض پر ڈٹی رہوں۔ میں کمزور ہوں، پاپن ہوں، ہتیاری ہوں۔"

رامیشوری بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

جب رامیشوری کو ہوش آیا تو اس کا ارادہ مستحکم ہو چکا تھا مگر دلی تکلیف ہو رہی تھی۔ کیا اسی لیے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اسی لیے پالا پوسا تھا کہ ایک دن اسے پھانسی پر چڑھتے دیکھوں گی۔ ونود اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ آج اسی ونود سے اس کا ناتا ٹوٹ رہا ہے۔ ونود کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ ایک دن وہ تھا کہ وہ اسے چھاتی سے لگائے پھرتی تھی، بڑے دکھ جھیل کر بھی خوش تھی۔ ایک دن یہ ہے کہ اسے پھانسی دلانے جا رہی ہے۔ ونود کی کتابیں اور کپڑے کمرے میں رکھے تھے۔ اس نے ایک ایک چیز کو چھاتی سے لگایا۔ آہ! فرض کا راستہ کس قدر دشوار گزار ہے۔ ونود کو آخری بار گلے لگانے اور اس کا آخری بوسہ لینے کے لیے اس کا دل بے چین ہو گیا۔ کیا لڑکے کو سزا دیتے ہوئے ماں محبت چھوڑ دیتی ہے؟

رامیشوری ونود کو سزا دینے جا رہی تھی۔ جوشِ محبت سے بھری ہوئی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پولیس نے سازش کا پتا لگا لیا۔ شہر کے دس جوان گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں میں سے ایک سرکاری گواہ بھی بن گیا اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ دائر ہو گیا۔

ونود کا اسی دن سے پتا نہ تھا۔ رامیشوری فرض اور محبت کے درمیان اس کشتی کی مانند ڈانوا ڈول ہو رہی تھی جس کے اوپر طوفانی آسمان ہو اور نیچے طوفانی سمندر! کبھی فرض کلیجے کو مضبوط کر دیتا، کبھی محبت دل کو کمزور کر دیتی۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے تھے فرض پسپا ہوتا جاتا تھا۔ نئی نئی دلیلیں اس کے احساس فرض کو کمزور کرتی جاتی تھیں۔ جب تمام کام ایشور کی مرضی سے ہوتا ہے تو اس میں بھی اس کی مرضی ہوگی۔ یہی سب سے زبردست دلیل تھی۔ ان سات دنوں میں اس نے صرف پانی پی کر دن کاٹے تھے اور وہ پانی بھی آنکھوں کے راستے نکل جاتا تھا۔ ایسی ہو گئی تھی جیسے برسوں کی مریضہ۔

دس بجے کا وقت تھا۔ وہ کانگریس کے دفتر کی طرف چلی۔ اسی وقت روزانہ ایک بار ونود کا پتا لینے کے لیے یہاں آیا کرتی تھی۔

ناگہاں اس نے نو دس جوانوں کو ہتھکڑیاں پہنے ایک درجن مسلح پولیس کے سپاہیوں کے پنجے میں گرفتار دیکھا۔ پیچھے تھوڑی دور پر کچھ عورتیں سر جھکائے رنج و یاس کی تصویر بنی آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھیں۔

رامیشوری نے دوڑ کر ایک سپاہی سے پوچھا: "کیا یہ کانگریس کے آدمی ہیں؟"

سپاہی نے کہا: ''کانگریس والوں کے سوا انگریزوں کو کون مارے گا؟''

''کون مارا گیا؟''

ایک پولیس سارجنٹ کو ان سب نے قتل کر دیا۔ آج آٹھواں دن ہے۔''

''کانگریس کے آدمی ہتیا نہیں کرتے۔''

''قصور نہ ثابت ہوگا تو آپ چھوٹ جائیں گے۔''

رامیشوری دم بھر وہیں کھڑی رہی۔ پھر انھیں لوگوں کے پیچھے پیچھے کچہری کی طرف چلی۔ فرض یہ نئی طاقت پا کر سنبھل گیا۔ نہیں! وہ اتنے بے قصور نوجوانوں کو موت کے منہ میں نہ جانے دے گی۔ اپنے خونی بیٹے کی حفاظت کے لیے اتنے بے گناہوں کا خون نہ ہونے دے گی۔

کچہری میں بہت بڑا مجمع تھا۔ رامیشوری نے ایک اردلی سے پوچھا: ''کیا صاحب آ گئے۔''

اس نے جواب دیا: ''ابھی نہیں آئے آتے ہی ہوں گے۔''

''بہت دیر سے آتے ہیں، بارہ تو بجے ہوں گے۔''

اردلی نے جھنجھلا کر کہا: ''تو کیا وہ تمھارے نوکر ہیں کہ جب تمھاری مرضی ہو آ کر بیٹھ جائیں۔ بادشاہ ہیں جب مرضی ہوگی آئیں گے۔''

رامیشوری چپ ہو گئی۔

اس کے پاس ہی کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک نے پوچھا: ''کیوں بہن! تمھارے گھر کا بھی کوئی لڑکا پکڑا گیا ہے؟''

رامیشوری اپنی فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ نہ بولی۔

اس عورت نے پھر کہا: ''کیا کہوں، نہ جانے کس پاپی نے خون کیا۔ آپ تو منہ پر سیاہی لگا کر چھپ رہا اور ہم لوگوں کے متھے گئی۔''

کئی عورتیں رو رہی تھیں۔ رامیشوری بھی رونے لگی۔

ایک ضعیف عورت اسے سمجھانے لگی: ''بہن چپ ہو جاؤ۔ جو ہماری قسمت میں لکھا ہے وہی ہوگا۔ میرا بیٹا بالکل بے قصور پکڑا گیا ہے۔ کانگریس میں کام کرتا تھا۔ تمھارا کون گرفتار ہے؟''

رامیشوری نے اسے بھی کچھ جواب نہ دیا۔ بار بار لوگوں سے پوچھتی تھی: ''صاحب کب تک آئیں گے؟'' دو بجے صاحب کی موٹر آئی، اجلاس میں ہل چل مچ گئی۔ جوں ہی صاحب کرسی پر بیٹھے سرکاری وکیل نے یہ خون کا مقدمہ پیش کر دیا۔ پولیس کے افسر آ گئے۔ ملزم بھی سامنے کھڑے کر دیے گئے۔

عین اسی وقت رامیشوری نے اجلاس کے روبرو آ کر سلام کیا اور صاف لفظوں میں بولی:

''حضور! اس مقدمے کے پیش ہونے سے پہلے میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔''

سب کے سب اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

صاحب نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''کیا بات ہے۔''

رامیشوری: ''میں اس لیے آپ کے سامنے آئی ہوں کہ اس مقدمے کا سچا حال بیان کروں۔ سارجنٹ کا خون کرنے والا میرا بیٹا ہے۔ یہ تمام ملزم بے گناہ ہیں۔''

صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا: ''تم اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟''

رامیشوری نے کہا: ''میں اپنے ہوش میں ہوں اور بالکل سچ کہتی ہوں۔ سارجنٹ کو میرے بیٹے نے مارا ہے۔ اس کا نام ونود بہاری ہے۔ میرے گھر میں اس کا فوٹو رکھا ہوا ہے۔ وہ اسی دن سے لاپتا ہو گیا ہے۔ میں اپنے ہوش میں ہوں۔ اپنے بیٹے سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں اسے اسی طرح پیار کرتی ہوں جیسے ہر ایک بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کو۔ ایک ہفتے پیشتر وہی میرا سب کچھ تھا لیکن جب میرے ہر چند منع کرنے پر بھی اس نے یہ خون کیا تو میں نے سمجھ لیا میرے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس کی جان بچانے کے لیے میں اتنے گھر برباد نہ ہونے دوں گی۔ میری ان بہنوں کو بھی تو اپنی اولاد اتنی ہی پیاری ہے۔ انھیں بے اولاد بنا کر میں اولاد والی نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

کمرے میں ہل چل مچ گئی۔ مرد عورت سب نے رامیشوری کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کئی عورتیں اس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ اپنی خوشی میں کسی کو اس بات کا خیال نہ رہا کہ اس بدنصیب کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ بے حس و حرکت درمیان میں کھڑی تھی، نہ کچھ سوجھتا تھا نہ کچھ سنائی دیتا تھا۔ بس ونود کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔

یکا یک مجمع میں سے ایک آدمی نکل کر رامیشوری کے سامنے آیا اور اس کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ رامیشوری چیخ مار کر گر پڑی اور حملہ آور کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: ''ارے تو ہے ونود!''

اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکلے اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

☆☆☆